حیدرآباد فرخندہ بنیاد سے شائع ہونے والا قدیم متوازن علمی وادبی ماہ نامہ

سب رس

ستمبر 2018ء
-/30روپے

ISSN 2278 6902

UGC'S Approved Urdu Journal-S.No.41103

ادارۂ ادبیاتِ اردو حیدرآباد

پروفیسر ایس۔اے۔شکور ڈائرکٹر/سکریٹری تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکیڈیمی اردو ہال حمایت نگر حیدرآباد میں مصور جناب احمد فصیح الدین (فخر تلنگانہ ودی) کے اسلامی پینٹنگس کی نمائش کے موقع پر منعقد کردہ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے۔ تصویر میں جناب محمد قمر الدین صدر نشین اقلیتی کمیشن حکومت تلنگانہ، مصور جناب احمد فصیح الدین جناب عبدالرحیم خان انجمن ترقی اردو، سینئر صحافی جناب ایم۔اے۔ماجد و دیگر اصحاب دیکھے جاسکتے ہیں۔

ڈاکٹر گل رعنا کی کتاب "مجتبیٰ حسین اور فنِ طنز و مزاح نگاری" کا رسم اجراء جناب زاہد علی خاں، کے ہاتھوں عمل میں آیا۔
پروفیسر اشرف رفیع، جناب سہیل وحید (ایڈیٹر "نیا دور" لکھنؤ) جناب مجتبیٰ حسین، پروفیسر بیگ احساس (صدر جلسہ)
جناب زاہد علی خاں، (ایڈیٹر سیاست)، ڈاکٹر گل رعنا، جناب عبدالحق، پروفیسر فاطمہ بیگم پروین و ڈاکٹر شجاعت علی راشد

بیادگار سید محی الدین قادری زورؔ

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

جلد: ۸۰ شمارہ: ۹ ماہ: ستمبر سال: ۲۰۱۸ء

مجلس ادارت

❁ سرپرست: راجکماری اندرادیوی دھن راج گیرجی

❁ صدر: جناب زاہدعلی خاں

❁ معتمدعمومی: پروفیسر ایس۔اے۔شکور

مجلس مشاورت

❁ پروفیسر گوپی چند نارنگ

❁ جناب مجتبیٰ حسین

❁ پروفیسر اشرف رفیع

مدیر

پروفیسر بیگ احساس

زرِسالانہ

❁ ہندوستان: **300روپے**

❁ پاکستان و بنگلہ دیش: 600روپے

قیمت: **-/30**

❁ کتب خانوں سے: **400روپے**

❁ مغربی وعرب ممالک سے 60ڈالر یا 40پاؤنڈ

Phone: 040-23313311 **Editor: 9849256723** Fax: 040-23374448

مراسلت وترسیل زر کا پتہ: ایوان اردو، پنجہ گٹہ روڈ، سوماجی گوڑہ، حیدرآباد .082 500 انڈیا

برقی پتہ: ***E-mail: idarasabras@yahoo.in***

چیک یا ڈرافٹ: **The Sabras Monthly, Hyderabad** کے نام سے ارسال کریں۔

بیرون حیدرآباد چیک کلیرنگ چارجس -/60روپے زیادہ

رسالے کی عدم دستیابی سے متعلق شکایت فون نمبر: 9949303546 / 9032566731 پر کیجیے۔

پرنٹر و پبلشر پروفیسر ایس۔اے۔شکور نے طٰہٰ پرنٹ سسٹمس، لکڑی کا پل میں طبع کروا کے ادارۂ ادبیات اردو سے شائع کیا۔

کلونجی

خواتین کیلئے قیمتی تحفہ

زیادہ سے زیادہ خواتین ہمارے بیوٹی پروڈکٹس کی منفرد کوالٹی کو محسوس کررہی ہیں۔
آپ کی بہتر سے بہتر انداز میں خدمت پر ہمیں فخر ہے۔
آپ کے حسن کیلئے اس سے بہتر کچھ نہیں۔

خواتین کا
مند پسند اور
آزمودہ نسخہ

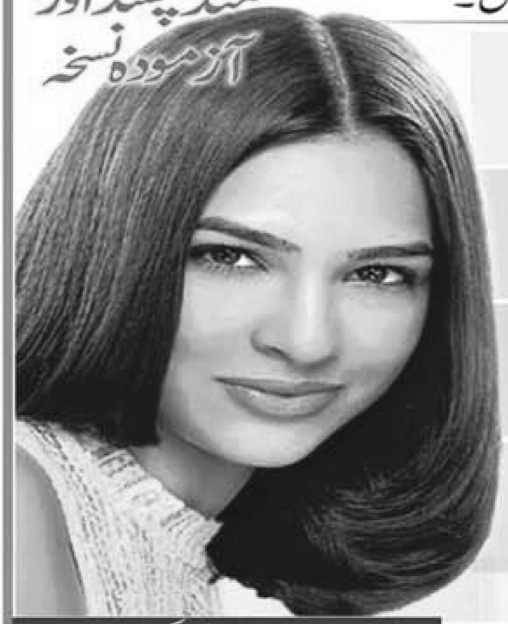

زم زم بہار ہیئر آئیل
• بالوں کا جھڑنا روکتا ہے۔ • سر میں بفادور کرتا ہے۔ • بالوں میں تازگی پیدا کرتا ہے۔ • بالوں کو لمبا کرتا ہے۔ • بالوں کی جملہ شکایات کیلئے مفید ہے۔ • سر درد دماغی سکون کے علاوہ چین کی نیند کیلئے مفید ہے۔

کلونجی فیرنس کریم
• چہرے سے داغ دھبے دور کرتا ہے۔
• جھائیوں اور زائد تیل کو نکالتا ہے۔
• چہرے کی جلد کی رنگت کو گورا ملائم اور خوبصورت بناتا ہے۔

کلونجی پمپل کریم
• چہرے کے کیل مہاسے • باریک داغ • چہرے کے جملہ داغ مٹاتا ہے • چہرے پر پیدا ہونے والی جھریوں کو ختم کرتا ہے • آنکھوں کے نیچے کالے حلقوں کو دور کرتا ہے۔

کلونجی ہربل ٹوتھ پاؤڈر
دانتوں کے جملہ امراض، دانت کا ہلنا، دانت میں تکلیف، دانت کا کیڑا، منہ سے بدبو آنا وغیرہ، میں نہایت مفید ہے

آپ بھی آزما کر دیکھئے

ہمارے دیگر پراڈکٹس

• کلونجی تیل • کلونجی مساج آئیل • کلونجی پین بام • سفوف ظہیر • اکسیر معدہ
• سفوف اپسرا • سفوف دمہ • کلونجی شوگر پاؤڈر • کلونجی چیون پراش
• اکسیر جگر • معجون کلونجی • کلونجی شیمپو پاؤڈر • مرہم کافوری • روغن گیسو دراز

حسن بے مثال کی شان
جو دیکھے یہی کہے، بہت حسین لگتی ہے۔

Mfg. Lic. No. 327/DU/98

MFG. MOHAMMEDIA PRODUCTS
Karim Nagar, (A.P.)

MRKT. BY S.J. AGENCIES
Opp : Rama Krishna Theatre, J.N.Road, Abids.
Ph : 66621834, 9346669505, 9346209091

ہمارے پراڈکٹس تمام میڈیکل ہال، دواساز اور جنرل اسٹورس پر دستیاب ہے

اس شمارے میں

اداریہ

	بیگ احساس	7

مضامین

دخمہ؛ تہذیب کی برہنہ نعش اور گِدھ	قدوس جاوید	8
حمید سہروردی سفر مدام سفر کا افسانہ نگار	فیاض رفعت	24
جاپان میں اردو کے حوالے سے، ہندو جاپان کے تہذیبی روابط	طیبہ نازلی	28
اسرار گاندھی کے افسانوں کا استعاراتی نظام	عمران عاکف خان	39
خواب اور خلش (جاں نثار اختر کے حوالے سے)	نوشاد کامران	44
کاغذ کی دیوار	رونق رئیس	47

آپ بیتی

یادیں	راجکماری اندرادیوی دھن راج گیرا اشرف رفیع	52

خودنوشت

ڈگر سے ہٹ کر قصہ پارینہ	سعیدہ بانو احمد	56

یادِ ماضی

گذشتہ حیدرآباد	لکشمی دیوی راج	63

افسانے

ریٹ لسٹ	مشتاق احمد وانی	65
بھوک	طیبہ خاں	70

شاعری

مظفر حنفی، مسلم نواز، سیفی سرونجی، مصداق اعظمی، ہارون شامی	جمال قدوسی، نسیم محمد جان، ابرار نغمی	76

اداریہ

انتخابات سے پہلے.....!

انتخابات کا بگل بج چکا ہے۔سیاسی پارٹیاں منصوبہ بندی میں مصروف ہیں۔موجودہ منظرنامہ یہ ہے کہ پٹرول کی قیمتیں آسمان کو چھورہی ہیں۔روپے کی قدر گرگئی ہے۔مودی جی جوحکومت میں آنے سے قبل پٹرول کی قیمتوں اور روپے کی گراوٹ پر سخت تنقید کرتے تھے اب خاموش ہیں۔رام دیو نے پٹرول 35 روپے فی لیٹر کرنے کا دعویٰ کیا تھا۔اب کچھ نہیں کہتے۔میڈیا کو خرید لیا گیا ہے۔عوام سہمے ہوئے ہیں۔سوشیل میڈیا پر اکثر گروپ درخواست کررہے ہیں کہ کوئی سیاسی پوسٹ نہ ڈالی جائے۔خوف کا یہ عالم ہے کہ ایسی پوسٹ فوراً ہٹادی جاتی ہے۔نوکریاں نہیں ہیں بے روزگاروں کی تعداد میں دن بہ دن اضافہ ہوتا جارہا ہے پتہ نہیں وزیرآعظم کی ہدایتیں پرعمل کرکے کتنے نوجوان نے پکوڑوں کا بزنس شروع کیا ہے۔نوٹ بندی فراڈ ثابت ہوئی۔جس سیاہ دھن کوختم کرنے کے لیے نوٹ بندی کی گئی اب اس میں سے تقریباً سارا پیسہ واپس ملک کے مالیاتی نظام میں واپس آگیا۔خودریزروبینک نے یہ بات بتائی ایسے میں یہ سوال مسلسل تکلیف پہنچارہا ہے کہ نوٹ بندی کیوں کی گئی؟ غریب اورمتوسط طبقے کے افراداور چھوٹے تاجرین نوٹ بندی سے بہت پریشان ہوئے۔مہینوں افراتفری کا عالم رہا۔ریزروبینک کی رپورٹ کے مطابق 217 ارب ڈالر مالیت کے جونوٹ بازار سے ہٹا لیے گئے تھے اس میں سے 93.3 فی صدواپس آگئے ہیں۔نوٹ بندی سے حکومت کو ملنے والے ٹیکس میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔نوٹ بندی کے نفاذ کے دو ہفتے بعد اس وقت کے اٹارنی جنرل مکل روہتگی نے سپریم کورٹ میں نوٹ بندی کا دفاع کرتے ہوئے کہا تھا کہ حکومت نے یہ قدم شمال مشرق اور کشمیر میں ہندوستان کے خلاف دہشت گردی کوفروغ دینے میں استعمال ہورہے چار لاکھ سے پانچ لاکھ کڑوڑ روپے تک کو چلن سے باہر کرنے کے لیے اٹھایا۔لیکن چار لاکھ سے پانچ لاکھ کڑوڑ روپے بینک میں واپس آگئے۔نوٹ بندی کی وجہ سے 100 سے زیادہ لوگوں کی موت ہوئی۔نوٹ بندی کے دوران بینک کے سامنے لگی قطاروں میں الگ الگ وجوہات کی بنا پر یہ اموات ہوئیں۔وزیرآعظم مودی نے 500 اور ہزار کے کرنسی نوٹ بند کیے لیکن 2000 کے کرنسی نوٹ متعارف کروائے جس قدر کثیر تعداد میں 2000 کے نوٹ پرنٹ کروائے گئے تھے ان میں 35 فی صد نوٹ بازار سے غائب ہیں۔وزیرآعظم نریندر مودی نے اس وقت عوام سے صرف 50 یوم کا وقت مانگا تھا تاکہ اس اسکیم پر موثر ومثبت نتائج برآمد کیے جاسکیں۔اگر وہ ناکام ہوجائیں تو وہ کسی بھی چوراہا پر خودکو عوام کے حوالے کردیں گے۔عوام انہیں جوچاہے سزادے سکتے ہیں۔لیکن عوام نے ایسا کچھ نہیں کیا۔جمہوری نظام میں چوراہے پر

سزا نہیں دی جاتی۔ دیکھنا یہ ہے کہ انتخابات کے موقع پر عوام کو یہ سب یاد بھی رہتا ہے یا نہیں۔

عوامی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے وزیر اعظم نریندر مودی کو قتل کرنے کی سازش کرنے کے الزام میں جہد کاروں کو گرفتار کیا گیا۔ ان میں تیلگو مصنف وراورا راؤ، سدھا بردواج، گوتم نولکھا، ارون فریرا اور ورنن گونسالویز شامل ہیں۔ لیکن سپریم کورٹ نے مداخلت کرتے ہوئے حکم دیا کہ ان جہد کاروں کو گھر پر نظر بند رکھا جائے پولیس تحویل میں نہ لیا جائے۔ چیف جسٹس دیپک مشرا کے زیر قیادت پنچ نے حکومت مہاراشٹرا اور پولیس پر واضح کر دیا کہ ناراضگی دراصل جمہوریت کی حفاظتی پرت اور اس کی ڈھال ہے۔

آر ایس ایس سربراہ موہن بھاگوت نے ساری دنیا کے ہندوؤں پر زور دیا کہ وہ متحد ہو جائیں۔ انھوں نے کہا کہ جنگلی کتّے اکیلے شیر کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ یہ اشارہ کس جانب ہے اس کی وضاحت کرنے کی چنداں ضروت نہیں ہے۔ ادھر شیوسینا نے بھی شوشہ چھوڑ دیا کہ بی جے پی نے ہندوؤں کے لیے کچھ نہیں کیا ملک کو سیکولر سمت میں لے جا رہی ہے۔

وجئے مالیہ لندن کی ویسٹ مجسٹریٹس کورٹ حاضری کے لیے پہنچے۔ لندن کی عدالت میں وجئے مالیا کی ہندوستان حوالگی کا مقدمہ چل رہا ہے۔ انھوں نے اخباری نمائندوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ گذشتہ برس ہندوستان چھوڑنے سے قبل انھوں نے وزیر فینانس سے ملاقات کی تھی ارون جیٹلی نے اس کی سختی سے تردید کی ہے۔ لیکن دال میں کچھ کالا ضرور ہے بی جے پی کے دور میں بڑے بڑے اسکام ہوئے ہیں۔

ٹی آر ایس نے تلنگانہ میں اسمبلی تحلیل کر دی اور وقت سے پہلے انتخابات کروائے جائیں گے۔

ایک افراتفری کا ماحول ہے۔ ایسے میں ہر شہری کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ سوچ سمجھ کر اپنے ووٹ کا استعمال کرے۔ اور خوف کے ماحول سے باہر آئے۔

☆☆

سب رس اگست 2018ء کے ٹائٹل کے متعلق بہت سے قارئین نے پوچھا کہ یہ تصویر کہاں کی ہے۔ دراصل یہ ایڈورڈ گڈآل کی پینٹنگ ہے جو سلطان حسن مسجد، قاہرہ کا اندرونی حصہ ہے۔

سب رس کی مشمولات کے بارے میں اپنی رائے سے نوازیں۔

بیگ احساس

قدوس جاوید

مضمون

دخمہ؛تہذیب کی برہنہ نعش اور گِدھ

اکیسویں صدی کا افسانہ؛ہندوستانی معاشرہ میں'' اقداری نظام'' کے انتشار و بحران کی صورت گری سے عبارت ہے۔ اسی لئے آج کا افسانہ مطالبہ کرتا ہے کہ اس کی قرات، سماجی، وثقافتی اورسیاسی و معاشی بیانیہ Soio cultural & Eco Political Narrative کے طور پر کی جائے ۔کیونکہ صرف بیگ احساس جیسے افسانہ نگار ہی نہیں قارئین بھی عصر حاضر کی پُر آشوب صورت حال کے اندر ہیں ۔ بیگ احساس کے افسانوی مجموعہ ''دخمہ'' کے بیانات سے'' گذرتے ہوئے معاصر افسانہ سے متعلق اس'احساس' کوتقویت ملتی ہے۔اب اگر یہ مان لیا جائے کہ ''دخمہ'' کا مطا لعہ ،سماجی، سیاسی ا ور ثقافتی بیانیہ کے طور پر ہی مناسب ہے تو پھر یہ بھی ماننے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ'دخمہ' کے حوالے سے بیگ احساس کی افسانہ نگاری کے انفراد و امتیازات کی تفہیم کے لئے ۴۷/تقسیم ملک/ آزادی سے لے کر آج اکیسویں صدی کی دوسری دہائی تک کے واقعات وسانحات کی آگہی بھی لازمی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ۴۷ء.سے قبل پاکستان کی کوئی تاریخ ہی نہیں،اور اگر کچھ ہے بھی تو اس کی جڑیں ہندوستان میں ہی پیوست ہیں ۔ دوسری جانب ۱۹۴۷ء.سے قبل کی ہندوستان کی پانچ ہزار سالہ تاریخ بحیثیت مجموعی یقیناً شاندار تو رہی ہے ۔لیکن ۴۷ کے بعد سے آج تک، ۱۹۸۵ء.میں اندرا گاندھی کے قتل کے بعد، سکھوں کا قتل عام اور ۱۹۹۲ء.میں بابری مسجد کی شہادت ، گجرات ، ممبئی کے فسادات اور اکھشر دھام مندر اور پارلیامنٹ پر حملہ،وغیرہ پے در پے ایسا بہت کچھ ہوا اور مسلسل ہو رہا ہے کہ، ہندوستان کی سابقہ تاریخ ہی نہیں، انسانیت بھی شرمسار ہو رہی ہے۔ امریکی'اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ آف پلاننگ کے سابق ڈپٹی ڈائریکٹر Francis Fukuyama نے''دیوار برلن'' کی مسماری کے حوالے سے اپنے مضمون The End Of History میں ،دیوار برلن کے گرنے کو ایک تاریخ کا خاتمہ قرار دیا ہے۔اس اعتبار سے سلطنت حیدرآباد کے خلاف 'پولس ایکشن اور پھر''سقوط حیدرآباد'' کو بھی'' ایک تاریخ کی موت'' قرار دینا شائد غلط نہ ہو گا تقسیم ملک اورآزادی کے ہم عمر، بیگ احساس (پ۔۱۰۔اگست۔۱۹۴۷ء.) نے ابھی جی بھر کے قلقاریاں بھی نہیں بھری ہوں گی کہ آزاد ہندوستان کی سیاست توبہ شکن انگڑائیاں لینے لگی۔اور مبینہ طور پر گاندھی،نہرو اور ابوالکلام آزاد کی مرضی کے بغیر،'' پولس ایکشن'' کے ذریعے حیدرآباد کی خود مختار نظام شاہی ریاست کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔کم وبیش تیس ہزار نفوس اس''ڈائریکٹ ایکشن '' کی بھینٹ چڑھ گئے۔ زوبر زائکی جان(Zubrzycki John)نے اپنی کتاب The LastNizam;The Rise& Fall Of India,s Greatest Prinely State. میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔اس کے علاوہ ،ابراہیم جلیس، سیدعلی ہاشمی اور محمد حیدر کی تصنیفات میں بھی ریاست حیدرآباد کے عروج وزوال کے بہت سارے مضمرات درج ملتے ہیں۔اقتدار سے محرومی تو سیاسی محرومی تھی ہی، لیکن صدیوں کی سجوئی تہذیب کے بکھراؤ نے حیدرآباد فرخندہ...کے ہر مہذب شہری کی روح اور ضمیر کو لہولہان کر دیا تھا۔ ہزاروں کی ہلاکت، اور جائز یا ناجائز طریقوں سے زمینوں پر قبضہ، مسلم تہذیب کی علامت عمارتوں کی قلب ماہئیت جیسے سانحات کو ذہن میں رکھیں تو ، کہنے والے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ آزاد ہندوستان میں، دو تہذیبوں کے درمیان ٹکراؤ، Mob Lynching ،لسانی بھید بھاؤ اور Land Grabing کی شروعات نظام حیدرآباد کی سلطنت کے خلاف ''پولس ایکشن'' کے ساتھ ہی ہوتی ہے۔

اس سانحے کے بعد، اس مہذب، روادار اور خوش حال سرزمین (حیدرآباد) کو اس طرح نوچا کھسوٹا گیا جیسے حیدرآباد کوئی

شہر نہ ہو'' دخمہ'' میں پڑی ہوئی کوئی برہنہ نعش ہو جسے گِدھ نوچ رہے تھے۔''۔ پولس ایکشن نے مسلمانوں کو حواس باختہ کر دیا تھا۔ مذہب کے نام پر ملک کی تقسیم سے پوری قوم سنبھلی بھی نہ تھی کہ زبان کی بنیاد پر...ریاست کے تین ٹکڑے کر دئے گئے۔ برسوں گذر جانے کے بعد بھی دوسری ریاستوں سے جڑے یہ ٹکڑے ان کا حصہ نہ بن سکے۔اپنی مستحکم تہذیب کی بنیاد پر ریاست کے یہ حصے ٹاٹ میں مخمل کے پیوند لگتے تھے۔ مذہب کے نام پر تقسیم کو عوام نے قبول نہیں کیا تو زبان کے نام پر ریاستوں کی حد بندیوں کو بھی ایک ہی زبان بو لنے والوں نے قبول نہیں کیا ۔دو مختلف کلچر۔؛ افسانہ'' دخمہ''۔ص۔۱۲۶۔'

پولس ایکشن کے سبب حیدر آباد کے مسلمان اپنی تاریخی اور تہذیبی جڑوں سے اکھڑ گئے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد پاکستان اور مغربی ممالک میں جا بسی۔ موقع غنیمت جان کر منصوبہ بند طور پر نئے لوگ حیدر آباد کی زمینوں پر قابض ہوتے چلے گئے، نہ کوئی تاریخ بچی نہ تہذیب۔'' پولس ایکشن کے نتیجے میں سیکولر مسلم تہذیب کے خوشحال مرکز (حیدر آباد) کی تاریخ بھی مسخ ہوگئی اور تہذیب کا بھی شیرازہ بکھر گیا۔

'' یہ تسلیم کر لیا گیا کہ تاریخی، تہذیبی، قومی، معاشرتی، جذباتی و ذہنی ہم آہنگی کی ساری روایتیں منہدم ہو چکی ہیں''۔ص۔۱۲۹'حیدر آباد، بیگ احساس کا عشق بھی ہے، تاریخ بھی اور تہذیب بھی، اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ بیگ احساس کے افسانے مرکز گریز (Centrifugal) نہیں بلکہ 'مرکز جو (Centripetal) ہوتے ہیں۔لہذا،'' دخمہ'' کے افسانوں کو نچوڑ کر دیکھئے، لفظ، لفظ الگ الگ صورتوں میں بیگ احساس کے اس حیدر آباد کی تاریخ اور تہذیب کے لُٹنے کا درد ہی ٹپکتا محسوس ہوگا۔ بیگ احساس نے '' دخمہ'' کے کئی افسانوں میں اس درد کی چند ٹیسوں کو ہی زبان دینے کی کوشش کی ہے۔

'' سمندر کے کنارے بسا یہ شہر تھا بھی خوبصورت۔ایک ایسی ریاست کا دارالخلافہ تھا، جس کا رقبہ اٹلی کے برابر تھا، جس کی آب و ہوا بحیرۂ روم جیسی تھی۔ پہاڑیوں سے گھرا باغوں اور جھیلوں کا شہر ،جس کی بنیاد محبت کی یادگار تھی جس کی ہواؤں میں مستی تھی اتنی مستی کہ آدمی پر نشہ طاری رہتا۔مخصوص بولی، مخصوص تہذیب، ان کا اپنا بادشاہ تھا، جس کو اعلی حضرت، حضور، فاتح دوراں، نوشیروانِ زماں، امیر المومنین، خلیفۃ المسلمین، حکیم السیاست، سلطان العلوم، سلطا ن ابن سلطان، خاقان ابن خاقان کے القاب سے بلاتے اس پر جان چھڑکتے۔ ان کیا پنی جامعہ، اپنی ریل، اپنا سِکہ، اپنا ٹپہ، اپنی فیکٹریاں، لوہے، کوئلے اور سونے کی کانیں تھیں۔سمنٹ کی پختہ سڑکیں خوبصورت عمارتیں تھیں دور دور سے تاجر یہاں آ کر آباد ہو گئے تھے۔اہل علم کی قدر افزائی ہوتی تھی....پھر وہ شہر کہاں گُم ہو گیا؟ درد کے خیمے؛ مشمولہ'' دخمہ۔ص۔۷۳۔

۲۔ ''جس شہر کی تاریخ نہیں ہوتی، اس کی تہذیب بھی نہیں ہوتی۔ نئے آنے والوں کی کوئی تاریخ تھی نہ تہذیب، ایک مستحکم حکومت کا دارالخلافہ سیاسی جبر کی و جہ سے ان کے ہاتھوں میں آ گیا ۔....زمین بیچنا یہاں کی تہذیب کے خلاف تھا۔شرما شرمی میں قیمتی زمینیں کوڑیوں کے مول فروخت کر دی گئیں۔آنے والے زمینیں خرید خرید کر کروڑ پتی بن گئے.....کسی کوٹھی میں صدر ٹپہ خانہ آ گیا، کسی حویلی میں انجینئرنگ کا آفس، کسی حویلی میں اے.جی.آفس تو کسی حویلی میں ہوٹل کُھل گیا۔ باغات کی جگہ بازار نے لے لی۔....چند برسوں میں سب کچھ بدل گیا۔ جو تہذیب کے نمائندے تھے، جو تہذیب کو بچا سکتے تھے ان میں سے کچھ اپنی زمینیں چھوڑ کر سرحد کے پار جا بسے تھے اور کچھ مغربی ممالک میں آباد ہو گئے۔ولی عہد نے مغربی ملک کو اپنا مسکن بنالیا۔'' افسانہ 'دخمہ'۔ ص۔۱۲۴۔

بیگ احساس نے '' دخمہ'' میں حیدرا باد کی تاریخ نہیں دُہرائی ہے، 'حیدر آباد مرکز' افسانے لکھے ہیں۔اوران افسانوں میں حیدر آباد کی '' گُم گشتہ تہذیب'' اور 'سلطنت' کی جاہ وسطوت کی تہوں کو کھولنے کے عمل کے دوران، بیگ احساس کمال ماہرانہ فن کاری کے ساتھ، افسانہ کی اصل کہانی کو بھی، فنی و جمالیاتی امتیازات

کو دونوں ہاتھوں سے تھامے رہتے ہیں۔اور پھر افسانہ کی تکنیک کا لحاظ رکھتے ہوئے۔اپنے افسانہ میں، اپنے کرب کو کم، اور اپنے نقطہ نظر کو مستحکم کرنے کی غرض سے، تاریخی، تہذیبی اور قومی جہات کو تقویت بخشتے ہوئے افسانہ کو ایک موڑ پر پہنچا کر خود کو افسانہ سے الگ کر لیتے ہیں۔اور تب، باذوق قاری آزادانہ اپنے طور پر افسانہ کی معنویت اور اثر پذیری خود قائم کرتا ہے۔یہ بیگ احساس کی افسانہ نگاری کا فنی اجتہاد (حامد بیگ کے الفاظ میں 'تدبیر کاری') ہے اسے افسانہ کی 'بُنت' کا مابعد جدید رویہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس ضمن میں والٹر.جے.سلاٹوف جیسے قاری اساس تنقید کے حامی د انشوروں کے حوالے سے گوپی چند نارنگ نے بھی لکھا ہے، ''متن میں معنی بالقوۃ موجود ہیں لیکن وہ عامل قاریہی ہے جو متن کے معنی کو موجود بناتا ہے۔یوں سمجھئے کہ، متن بارود کی ٹکیہ ہے قرات کا عمل فتیلہ دکھاتا ہے جو اشتعالک پیدا کرتا ہے اور یوں وہ پھلجھڑی روشن ہوتی ہے جس کو معنی کا چراغاں کہتے ہیں۔۔فرق یہ ہے کہ بارود کی طرح چراغاں کے بعد متن غائب نہیں ہوتا بلکہ جوں کا توں موجود رہتا ہے، اور ہر آنے والی قرات، قاری کے ذوق وظرف کے مطابق از سرِ نو معنی کا چراغاں پیدا کرتی ہے اور یہ عمل لا متناہی ہے۔ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات؛ص۔۲۷۹

واقعہ یہ ہے کہ ''دخمہ'' کے افسانے بھی اپنی (بعض دستاویزی) جزیات کی بنا پر ہر نئی قرات کے ساتھ معنی ومفہوم کے نئے امکانات کا چراغاں کرنے کا جوہر رکھتے ہیں۔دوسری بات یہ کہ، بیگ احساس کے سابقہ افسانوں کے مقابلے میں ''دخمہ'' کے کئی افسانوں (چکرویوہ، شکستہ پر، دھار، نمی دانم وغیرہ میں ہئیتی اعتبار سے بھی اجتہادی واختراعی تنوع کی 'دھار' کچھ زیادہ ہی تیز نظر آتی ہے ہے۔اس کی نشاندہی مرزا حامد بیگ نے بھی دیباچے میں مثالوں کے ساتھ کی ہے۔اس کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ، ''دخمہ'' کے افسانوں کی 'قرات'، افسانہ کے روائتی اور مروجہ ہئیتی نظام (System of Forms) کے بجائے 'اطواری نظام' (System of Modes) کی رُو سے کی جائے تو ان افسانوں کے تاریخی وتہذیبی اور سیاسی وسماجی واقعات وکیفیات پر مبنی ساختیوں کو، افسانہ کے بیانیہ تسلسل میں زیادہ بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ساختیاتی مفکر نارتھروپ فرائی (Northrop Frye) کا بھی یہ ماننا ہے کہ 'اطواری نظام' کی رُو سے فکشن میں تاریخی و تہذیبی جہتیں بیانیہ کا حصہ بن سکتی ہیں۔ٹوڈوروف کا نظریہ بھی یہی ہے کہ افسانوی ادب کی ذیل میں آنے والا ہر فن پارہ، بے شک افسانوی ادب (ناول افسانہ) کی شعریات کی رُو سے ہی لکھا جاتا ہے لیکن فنی اور جمالیاتی اعتبار سے کسی بھی افسانوی تخلیق کے انفراد وامتیاز کا انحصار ہی اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ اپنی صنف (مثلاً افسانہ) سے متعلق عام تصور میں کسی نہ کسی حد تک ترمیم واضافہ کا سبب بھی بنے۔''مابعد جدید تھیوری'' کے مطابق بھی کوئی بھی صنف (مثلاً افسانہ) منجمد نہیں ہوتی بلکہ 'حرکیاتی' وجود رکھتی ہے۔اردو میں منٹو، بیدی سے لے کر جوگندر پال تک کے یہاں اس کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔بیگ احساس کے ''دخمہ'' میں بھی 'دخمہ'، سنگ گراں، درد کے خیمے اور 'چکرویوہ'.....وغیرہ ایسے افسانے ہیں جو صنف افسانہ کے فنی و جمالیاتی امکانات کو روشن کرتے ہیں۔مرزا حامد بیگ نے بھی لکھا ہے کہ ''میں اس مجموعے میں شامل افسانے ''رنگ کا سایہ''، ''دخمہ''، ''نمی دانم کہ...''، ''دھار'' پڑھ کر یکسر حیران رہ گیا اور بارہا افسوس کیا کہ بیگ احساس کے افسانے اس وقت میری نظروں سے کیوں نہ گذرے، جب میں ''افسانے کا منظر نامہ'' (طبع اول۔۱۹۸۱ء.) پر کام کر رہا تھا''۔ص۔۱۲۔

بیگ احساس کے ساتھ کے اور بھی چند ایک فسانہ نگار ہیں (جو اپنی اپنی جگہ الگ الگ امتیازات کے حامل ہیں)، مثلاً سلام بن رزاق، حسین الحق، مشرف عالم ذوقی، علی اما نقوی، شوکت حیات، شموئل احمد، عبد الصمد، صدیق عالم، شائستہ فاخری اور لالی چودھری .....وغیرہ، جو آج معاصر افسانہ میں اپنی اپنی جگہ 'سنگ میل' کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان میں سے کسی کو کسی سے کم تر یا برتر قرار دینا، نہ تو آسان ہے اور نہ اس کی ضرورت ہی ہے۔ایک نئے ''وژن'' کے ساتھ ایسے سبھی افسانہ نگاروں کے

تخلیقی اور فکری امتیازات سے، بحیثیت مجموعی معاصر اردو افسانہ کے نئے آفاق وجود میں آرہے ہیں۔ایسے میں بیگ احساس کی افسانہ نگاری کے بھی مخصوص امتیازات کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔مثلاً 'افسانہ' دخمہ' کو ہی لیں۔ بیگ احساس نے پہلی بار ہندوستان کی (غالباً) سب سے چھوٹی اقلیت '' پارسی'' کے ،سماجی، سیاسی ،معاشی، مذہبی اور قومی مضمرات اور مسائل کو پیش کیا ہے۔ وہ بھی اس طرح کہ،سلنت حیدرآباد کے شاندار ماضی سے لے کر پولس ایکشن سے قبل تک کی بین المذہبی معاشرتی ساخت اور سیاسی و تہذیبی 'رواداری' کی ان ڈھیر ساری سچائیوں کی تہیں کھل جاتی ہیں جو اب قصہ پارینہ ہو چکی ہیں ۔ پارسیوں کو جب ایران سے مسلمانوں نے نکالا تو سالار جنگ اول کی دعوت پر پارسیوں کی ایک بڑی تعداد اپنی مرضی سے حیدرآباد آئی تھی۔

''اس ریاست کو ہم آصف جاہی سلطنت کے چرچے سن کر آئے تھے۔ ہمارے اجداد کو سالار جنگ اول نے مدعو کیا تھا ۔انتظامیہ میں ہمیں شامل کیا گیا ۔میر محبوب علی خاں نے ہمیں خطابات سے نوازا تھا۔نواب سہراب جنگ ،فرام جی جنگ،فریدون الملک وغیرہ وغیرہ۔فارسی یہاں کی سرکاری زبان تھی اور اردو عوامی زبان،بریانی،نوابوں اور موتیوں کا شہر۔ گجراتی، مارواڑی،سندھی سبھی آبسے تھے۔سب کو آزادی حاصل تھی۔سب نے اپنی اپنی عبادت گاہیں تعمیر کرلیں۔شاہی خزانے سے مدد بھی ملتی تھی۔ہمارے لئے تو بہت سازگار ماحول تھا۔ بڑا عجیب معاشرہ تھا۔

آپ کو یاد ہے؟نہیں آپ تو بہت چھوٹے رہے ہوں گے۔تھیٹر میں جب ہم فلم دیکھنے جاتے تو درمیان میں ایک سلائیڈ دکھائی جاتی ''وقفہ برائے نماز''۔لوگ جلدی جلدی فرض نماز پڑھ کر تھیٹر لوٹ آتے۔رند کے رند رہے، ہاتھ سے جنت نہ گئی والا معاملہ تھا''

آپ کو شاہی دور پسند تھا؟

نہیں 'رواداری پسند تھی۔معاشرے کا کھلا پن اچھا لگتا تھا۔اب تو کٹرپن آ گیا ہے ہر قوم میں۔''

ہاں مسلمان بھی خدا حافظ کی جگہ اللہ حافظ اور نماز کی جگہ صلوۃ کہہ کر بہت خوش ہونے لگے ہیں''میں نے کہا ۔افسانہ۔دخمہ۔ص۔۱۳۲۔

اس اقتباس میں حیدرآباد کے اُجڑنے کا نوحہ بھی ہے،ایک منفرد، روادار تہذیب کے خاتمے کا درد بھی اور ایک چھوٹی اقلیت کے زوال کا ماتم بھی۔جو یقیناً بیگ احساس کی 'حساس' سیکولر اور انسان دوست طبیعت کی غماز ہے۔پورے ملک میں دوسری قوموں کی آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے،لیکن پارسیوں کی آبادی ہر جگہ گھٹتی جا رہی ہے۔''دخمہ'' کے مرکزی پارسی کردار سہراب کی زبانی ، بیگ احساس اس کے اسباب بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں''.... پارسی غیر مذہب میں شادی نہیں کر سکتے۔اس مذہبی شرط کی وجہ سے ہماری تعداد گھٹتی جا رہی ہے۔اب پورے (حیدرآباد)شہر میں بارہ سو پارسی رہ گئے ہیں۔''ص۔۱۳۳۔

بیگ احساس نے اس موقع پر''دخمہ'' کی اصطلاح کے حوالے سے،پارسیوں کے عقائد پر بھی روشنی ڈالی ہے جن سے عام قارئین شائد واقف نہ ہوں۔''دخمہ'' سے مراد پارسیوں کی آخری منزل(قبرستان) کے بطور استعمال ہونے والی ایک مخصوص قسم کی گول عمارت ہے۔جس کی چھت پر مرنے والے کی برہنہ نعش رکھ دی جاتی ہے،تاکہ' گدھ'اس نعش کو نوچ کھائیں اور مرنے والے کو ثواب ملے۔اس عمارت (دخمہ) کی چھت ،درمیان سے اونچی ہوتی ہے۔چھت پر تین دائرے ہوتے ہیں،۔مرد کی نعش بیرونی د ائرے میں،عورت کی درمیانی دائرے میں اور بچوں کی نعش اندرونی دائرے میں رکھی جاتی ہے،تاکہ ان پر تیز دھوپ پڑے اور گدھوں کو دور سے نظر آئے۔آخری رسومات کی ادائگی کے لئے مرنے و الے کے عزیز واقربا،دو،دو، کی قطار میں ایک رومال نما کپڑے کا ٹکڑا پکڑے آتے ہیں جسے''پیوند'' کہتے ہیں۔''دخمہ'' کے پاس ایک 'عجیب الہئیت' کتا بھی ہوتا ہے۔پارسی اسے''سگ دید'' کہتے ہیں۔چار آنکھوں والا کتا....اس کی چار آنکھیں نہیں ہوتی ہیں

،لیکن آنکھوں پر ایسے نشان ہوتے ہیں جس سے اس کی چار آنکھیں نظر آتی ہیں۔ پارسیوں کے عقیدے کے مطابق، یہ ''سگ دید'' ہی آدمی کے 'نیک و بد' ہونے کا فیصلہ کرتا ہے۔ پارسی بڑے خوش اخلاق اور مہذب ہوتے ہیں ۔منفرد عقائد اور رسومات کی طرح پارسیوں کی بعض مخصوص 'ڈشیز' (پکوان) بھی ہوتی ہیں مثلاً براؤن رائس، دھن سک ،ساس اِن مچھی ، کچومر سلاد ، موامی بوئی (مچھلی کا میٹھا) وغیرہ۔

بیگ احساس نے یہ ساری تفصیل 'دخمہ' کے مرکزی کردار سہراب کے حوالے سے پیش کی ہیں۔ سہراب ،شہر کے مصروف علاقے میں'' مئے کدہ'' کے نام سے شراب خانہ چلاتا تھا۔ 'دیانت داری'' مئے کدہ'' کی سب سے بڑی خوبی تھی۔ لیکن برسوں بعد، افسانہ نگار نے جانا کہ'' مئے کدہ'' بند ہو گیا ہے ۔ ''مسلمانوں نے حکومت سے شکایت کی تھی کہ'' مئے کدہ'' مسجد سے بہت قریب ہے جو خلاف قانون ہے''۔

''مسلمان بھی بہت کٹر ہوتے جا رہے ہیں''۔

''اور آج اطلاع ملی کہ سہراب مر گیا

اس موقع پر، بیگ احساس اور حیدر آباد کی تہذیبی 'روا داری ان الفاظ میں سامنے آتی ہے،'' مجھے بار بار یہی خیال آتا تھا کہ'' مئے کدہ'' کے بند ہو جانے کا اس پر بہت اثر ہوا ہوگا۔ اس لئے شاید وہ زیادہ جی نہ سکا ہوگا۔ میں Guilty محسوس کر رہا تھا۔ اس کا اپنا کوئی نہ تھا۔ دور کے رشتے دار اور چند احباب تھے''۔ 'دخمہ۔ص۔۱۳۴۔

وسیع تناظر میں دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ ۴۷ء. کے بعد ، زندگی کے تمام شعبوں میں ، مِن حیث القوم ہندوستانی مسلمانوں کی حالت دن بہ دن، بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد بھی ہجرت نہ کرنے والے ہندوستانی مسلمانوں کے تاریخی، مذہبی، قومی اور تہذیبی تشخص کی مستقل بیخ کُنی ہوئی (اور گائے، گھر واپسی، لو جہاد، اور اذان، کے عنوان سے مسلسل ہو رہی ہے)۔ ہر شخص جانتا ہے کہ'' سچر کمیٹی'' کی رپورٹ کے مطابق آزادی کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی حالت دلتوں سے بھی زیادہ بدتر ہو چکی ہے ۔ Walk Free Foundation کے InternationalSlaveryIndex.2018. میں نارتھ کوریا، ایریٹیریا، برونڈی، سینیگال افریقن ریپبلک اور افغانستان کے ساتھ ہندوستان بھی شامل ہے ۔آج ہندوستان میں آٹھ ملین سے زیادہ لوگ Modern Slavery کی حالت میں زندگی جینے پر مجبور ہیں۔ اور ان میں مسلمانوں اور دلتوں کی اکثریت ہے۔ ہندوستان میں، ہندوؤں کی اکثریت سیکولر اور امن پسند ہے اس کے برعکس مسلمانوں میں بھی بنیاد پرست عناصر کی کمی نہیں ۔لیکن یہ بھی سچ ہے کہ پارلیامنٹ میں'' رام زادے'' اور'' حرام زادے' جیسے الفاظ استعمال کرنے اور بات بات پر مسلمانوں کو 'پاکستان' کی گالی دینے والوں کی مذمت کرنے کے بجائے Glorify کرنے کا رویہ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کو شرمسار کر رہا ہے۔'' ہندوتو'' اور تہذیبی قویت (Cultural Nationalis) کے مٹھی بھر حامی ،دوسری قوموں اور ان کی تہذیبوں پر، دخمہ کے'' گِدھوں'' کی طرح، انھیں نوچ کھانے کے لئے منڈرا رہے ہیں، دوسری جانب آج ، ملک کے مختلف طبقات (دلت اور سوَرن) کے مابین تشدد آمیز نفرت کی دیواریں کھڑی ہو رہی ہیں، بڑے شہر ہی نہیں، بہار اور اتر پردیش کے چھوٹے اور منجھولے شہروں (مظفر پور ،دیوریا وغیرہ) کے Shelter Homes میں بے سہارا یتیم لڑکیوں کی عصمت دری ہو رہی ہے۔ ملک کے مختلف حصوں میں چھ ماہ کی بچی سے لے کر ساٹھ سال کی بوڑھی ماں تک کا لحاظ نہیں رکھا جاتا جنسی جرائم کے بڑھتے ہوئے واقعات پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے ہندوستان کے'' سپریم کورٹ'' نے مرکزی حکومت کی سرزنش بھی کی ہے اور کہا ہے کہ آج کی تاریخ میں ہر چھ گھنٹے میں ایک'' بلاتکار'' ہو رہا ہے۔ یہ واقعات یہ تاثر دے رہے ہیں جیسے بعض جنونی، نفسیاتی مریض ، بے لگام پورے ملک کی معصوم لڑکیوں/عورتوں کو نر بھیا بنانے پر آمادہ ہیں۔ ایسے عبرت ناک حقائق کے سبب آج وطن عزیز کا

ماحول اور معاشرہ، تہذیبی و اخلاقی پستی کی اس انتہا تک پہنچ چکا ہے جہاں پر عظیم جمہوریہ ہند کی ساری ''گوروگاتھائیں'' Grand (Narrations) داغ دار ہو رہی ہیں۔ ہندوستان کے اس سماجی، سیاسی، تہذیبی اور اخلاقی منظرنامے کو، اوسط درجے کے ادیب اور قارئین، تخلیقی ادب کے لئے غیر ضروری بھی قرار دے سکتے ہیں۔لیکن اول تو یہ پرانا محاورہ آج بھی سچا ہے کہ ادب 'خلا' میں پیدا نہیں ہوتا۔ دوئم یہ کہ کوئی بھی ادیب، لاکھ کوشش کیوں نہ کر لے، کسی نہ کسی زاویئے سے اس کی تحریر کے پاؤں ہر حال میں اپنی ز مین اپنے ماحول میں لازمی طور پر ٹکے ہوں گے، اس تناظر میں یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ بیگ احساس یا کسی بھی تخلیق کار کی ذہنی ساخت، 'نظر، تخلیقیت (Creativity) اور اظہار و بیان پر اس صورتحال کے اثرات مرتب نہ ہوں۔ آزادی کے بعد کے ایسے ہی سیاسی،، سماجی، اور ثقافتی مدوجزر نے بیگ احساس سے ''دخمہ''، سنگِ گراں، سانسوں کے درمیاں' درد کے خیمے' اور دیگر افسانے لکھوائے ہیں۔

''دخمہ'' کے دیباچے میں، اردو افسانہ کے معتبر محقق اور نقاد، مرزا حامد بیگ نے بیگ احساس کی افسانہ نگاری کا جس عالمانہ انداز میں جائزہ لیا ہے وہ حامد بیگ کی افسانہ شناسی کی اعلی مثال تو ہے ہی ساتھ ہی، یہ دیباچہ، افسانوی ادب کے حوالے سے مدلل، منطقی، اور معتبر' جدید دیباچہ نگاری' کے نئے امکانات بھی روشن کرتا ہے۔''دخمہ'' کی بنیاد پر، بیگ احساس کی افسانہ نگاری کے انفرادو امتیاز کی تفہیم کے لئے حامد بیگ کا دیباچہ ہی بہت کافی ہے۔لیکن چونکہ بیگ احساس کے ''دخمہ'' میں شامل افسانے، خود حامد بیگ کے بقول'' قاری کو حیران کرنے والے ہیں''، اس لئے ان افسانوں کے حیران کُن یا دوسرے لفظوں میں غیر مانوس (Defamiliar) موضوعات، واقعات، کردار، ساختیوں اور اظہاری و بیانیاتی رویوں (NarrativeAttitudes) کو گرفت میں لینے اور ان کی مزید توضیح و تعبیر کے لئے بیگ احساس کے 'دخمہ' میں شامل افسانوں کی قرات، اور تفہیم و تعبیر کا سلسلہ رُک بھی نہیں سکتا۔ ان افسانوں کی معنوی اور تاثراتی تہہ داریاں، کب، کس قاری کی، کیسی قرات کے نتیجے میں، کس حد تک بے پردہ ہو جائیں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ یوں بھی، آج کے افسانہ کی طرح افسانہ سے متعلق گفتگو کا بھی کوئی اختتام نہیں ہوتا۔ Epistemology کی رُو سے بھی ہر نئے عہد میں، برق رفتاری سے بدلتے، ذات، زندگی اور زمانہ کے حالات وکوائف نت نئے حقائق، مسائل، مباحث، توقعات، تعصّبات اور نظریات وتصورات، سامنے لاتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں مصنف اور قاری دونوں کی 'شئے' کی حقیقت دیکھنے والی 'نظر' اور تجزیہ کرنے والی 'فکر' بھی بدلتی رہتی ہے۔ لہذا فطری طور پر زندگی کی طرح ادب کو بھی جینے اور برتنے کے رویے بھی بدلتے رہتے ہیں۔ اسی لئے وقت کے ہر دورانئے میں کسی بھی افسانہ یا افسانہ نگار کے فن سے متعلق نت نئ تعبیرات و توضیحات کے امکانات روشن ہوتے رہتے ہیں۔ 'کفن، ٹوبہ ٹیک سنگھ، اور لاجونتی' وغیرہ پر اب تک کتنا اور کس کس طرح سے، سوچا اور لکھا جا رہا ہے، اس کا شمار مشکل ہے، لیکن ابھی بھی ایسا لگتا ہے جیسے ان افسانوں پر ابھی بھی بہت کچھ لکھنے کی گنجائش باقی ہے۔ چنانچہ پریم چند، منٹو اور بیدی کے مذکورہ افسانوں کی طرح، بیگ احساس کے افسانوں ''دخمہ'، سنگِ گراں، درد کے خیمے، سانسوں کے درمیاں، چکرویوہ.......وغیرہ 'میں، کہیں سادہ اور کہیں استعاراتی اسلوب میں ایسے بہت سارے 'حکیمانہ' اور سحرآفریں (Magical) بیانئے Narratives ہیں جنھیں بار بار پڑھنے اور سمجھنے کے بعد بھی یسا لگتا ہے جیسے ان افسانوں میں ابھی بھی ایسا بہت کچھ ہے جن تک غیر جانب دار اور باضمیر قارئین اور ناقدین کی رسائی باقی ہے۔ مثلا دخمہ کی ان چند ایک عبارتوں پر غور کریں:

ا۔''قدیم عبادت گاہ ہٹ دھرمی سے گرادی گئی تو بہت کھ بدل گیا ۔...ایک بڑی طاقت تاش کے پتوں کی طرح بکھر کر رہ گئی تھی۔ کل تک جو سوشلسٹ لیڈر تھے، بائیں بازو کے اخبارات شائع کرتے تھے، وہ کٹر مذہبی جماعتوں کے تلوے چاٹنے لگے تھے۔

تبدیلی اس کی کالونی میں بھی آئی تھی۔...محلے کے بچوں نے اس کے نواسوں کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔ پاکستانی..... پاکستانی.....:

اس کے تن بدن میں آگ لگ جاتی تھی۔جس ملک سے اس نے کوئی واسطہ نہیں رکھا، وہی اس کے بچوں کے سروں پر تھوپا جا رہا ہے۔نانا جی .وہ ہمیں پاکستانی کیوں کہتے ہیں ؟وہ چُپ رہا۔

''کیوں کہ ہم مسلم ہیں''۔بڑے نواسے نے کہا۔کیا تمام مسلم پاکستانی ہوتے ہیں؟ پھر سوال کیا گیا۔اس نے کوئی جواب نہیں دیا ۔افسانہ''دھار''۔مشمولہ۔'دخمہ'۔ص۔۹۸۔

۲۔ ''یہ شہر کی ایک خوبصورت کالونی ہے۔یہاں سب اقلیتی فرقے کے افراد رہتے ہیں۔ان میں ایک بہت عزت دار آدمی بھی ہے جو اقتدار کے ایوان میں بیٹھا کرتا تھا...اطراف میں اکثریتی فرقے کے لوگ رہتے ہیں وہ سب شریف آدمی ہیں...صبح ایک ذمہ دار محافظ،عزت دار آدمی کے گھر آتا ہے..وہ اسے یقین دلاتے ہیں کہ ان کی مکمل حفاظت کی جائے گی ...ان لوگوں کو گئے ہوئے پانچ منٹ بھی نہیں ہوئے کہ ایک روٹی کی دکان اور تین پہیوں کیا یکسواری جلا دی گئی۔...عزت دار آدمی کی انگلیاں مسلسل حرکت میں ہیں۔وہ کوئی نمبر ملا رہا ہے یا کئی نمبر ملا رہا ہے لیکن کوئی نمبر نہیں ملتا۔...اب گھروں پر ...عقبی حصے سے بھی پتھر، ایسیڈ بلب، کیروسین کی بوتلیں، پٹرول بم پھینکے جا رہے ہیں...ہجوم ایک شخص کو گھیرے ہوئے ہے ..تلوار چمکی،اس کا جسم تین ٹکڑوں میں کٹ گیا ۔...جسم کے وہ ٹکڑے آگ میں جھونک دئے گئے۔چر...چر..چر..تازہ گوشت کے جلنے سے،عجیب سی بو پھیل گئی ۔آگ کے شعلے ،دھواں ، جلتے گوشت کی بُو،پتھروں کی بارش ...عزت دار آدمی اور دوسرے خوف زدہ ہیں ۔ان کی کالونی کا مضبوط آہنی گیٹ ہجوم نے توڑ دیا۔افسانہ''چکرویوہ''۔دخمہ۔ص۔۶۱۔

۳۔ گُھس جاؤ.....ہجوم نے حلق پھاڑ کے آواز لگائی۔۔

عزت دار آدمی کی انگلیاں درد کرنے لگیں لیکن کہیں رابطہ نہیں ہوا...اچانک وہ گُھس پڑے اور مردوں کو بڑی بے دردی سے کھینچا جا رہا ہے ..ہجوم ان کے ٹکڑے کر رہا ہے....بے رحمی،سفاکی،آنکھوں میں خون،...عورتوں کے ریزہ ریزہ ہوئے عصمتیں تار تار ہوئیں شفاف جسم داغ دار ہوئے ۔وہ جسم جن کی جھلک بھی کسی نے نہ دیکھی تھی،انھیں سڑکوں پر بھنبھوڑا جا رہا ہے ۔آہ و بُکا ،چیخیں،آنسو،جسم ہوس کا ساتھ نہیں دے پا رہے ہیں،جھلاہٹ ،جسم کے ٹکڑے ٹکڑے پھر آگ ...چر...چر...وہی عجیب سی وحشت ناک بُو۔کوئی محافظ نہیں آیا۔سورج نیچے آ گیا ہے ۔عزت دار آدمی تک وہ پہنچ گئے۔وہی ان کا اصل شکار ہے ...وہ بری طرح ٹوٹ پڑے ۔دھکے مار کے باہر نکالا گیا..بے لباس کرنے میں چند لمحے لگے ...وہ چیخ چیخ کر اس سے مطالبہ کرنے لگے،بول.....جئے شری رام.....بول....اس کی زبان پر تالے پڑے تھے ...انھوں نے اسے تھپڑ اور گھونسے لگائے ،لاتوں سے مارا،پھر ایک ہتھیار چمکا اس کے ہاتھوں کیُ انگلیاں کاٹ دی گئیں۔انگلیاں جن کے سہارے وہ نمبر گھما گھما کر مدد مانگ رہا تھا ۔تحفظ چاہتا تھا۔بول .....بول....مغلظات کا طوفان ابل پڑا ۔....اس کے پورے بدن سے خون بہنے لگا۔جسم سے ٹپکتا خون...بے لباس بدن...اس کے پیروں کے اگلے حصے کاٹ دئے گئے۔وہ بار بار گرتا رہا.ایک طرف لڑھکا گیا۔تب ایک تیز دھار والا ہتھیار اس کیگردن میں دھنسا دیا گیا ۔اس کے جسم کو گھسیٹ کر درمیان میں لایا گیا،جسم کے تین ٹکڑے کئے گئے اور پھر آگ کا الاؤ۔۔۔چر..چر..وہی بُو،....انسانی گوشت کے جلنے کی بُو۔

افسانہ؛ چکرویوہ۔دخمہ۔ص۔۶۳۔

۴۔''ہاں ہمیں تحریر و تقریر کی آزادی ہے۔لاؤڈ اسپیکر پر اذانیں بھی گونجتی ہیں۔میں نے کہا۔یہاں (پاکستان میں) گولیاں بہت چلتی ہیں۔جن تیس ہزار لاشوں کو ہم نے ایک بڑا حادثہ سمجھا تھا،وہ کچھ بھی نہیں ہے۔یہاں تو لاشوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔نوجوان آسائشوں کی تلاش میں دور دور تک چلے گئے ہیں۔...عورتیں کچھ تو اپنے شوہروں کے پاس لی گئی ہیں اور جو

یہاں رہ گئی ہیں وہ رات رات بھر ٹی.وی. کے سامنے بیٹھتی ہیں اور صبح دیر سے جاگتی ہیں۔مرغن غذائیں کھا کھا کر موٹی ہوتی جارہی ہیں ،پھر G Y M چلی جاتی ہیں۔'' افسانہ ؛درد کے خیمے۔'دخمہ۔ص۔۱۷۔

وقت اور حالات ، حقائق اور مسائل،آئیڈیالوجی اور ادبی تھیوری کے حوالے سے بیگ احساس کے فن،مقام اور مرتبہ پر دس رنگ سے گفتگو کی جاسکتی ہے۔اس کا اندازہ لگانے کے لئے'' دخمہ'' میں شامل بیگ احساس کے ایک آدھ اور افسانوں کے اندر، ان اقتباسات کے زینوں سے اُتر کر دیکھ لیتے ہیں'' قدیم عبادت گاہ کے گرنے کے تقریباً دس برس بعد، جدید طاقت، تہذیب و معاشرت کی علامت دو عمارتیں اچانک گرادی گئیں اور پھر بہت کچھ بدل گیا۔عمارتیں گرتی ہیں تو بہت کچھ بدل جاتا ہے۔پھر کچھ نئے الفاظ آئے جن میں زیادہ شور، تہذیبوں کا ٹکراؤ اور دہشت گردی کے خلاف ردعمل، ایٹمی ہتھیار رکھنے والے ممالک کا صفایا تھا ۵۔ .....دوسرا رُخ یہ ہے کہ کہیں بھی بم بلاسٹ ہوتا ہے ،دہشت گردی ہوتی ہے تو لوگ اس کی طرف عجیب نظروں سے گھورتے ہیں، جیسے ہر دہشت گردی کا ذمہ دار وہ ہو۔پولس راتوں رات اس کے محلے سے نوجوانوں کو پکڑ کر لے جاتی ہے۔

....تمھاری داڑھی؟ آہستہ آہستہ کم کردی۔اب کلین شیو ہو جاؤں گا۔

لیکن کیوں؟ صرف داڑھی رکاوٹ بن گئی ہے۔افسانہ؛ دھار۔دخمہ۔ص۔۱۰۴۔

''دھرت راشٹر نے پوچھا۔'اے سنجے، مجھے بتاؤ، اتنے سارے لوگ اپنے اپنے ہاتھوں میں ہتھیار اٹھائے...کیا کر رہے ہیں؟ سنجے نے جواب دیا۔..وہ لوگ ایک جاتی کو نشٹ کر دینا چاہتے ہیں۔کیا ایسا ممکن ہے؟ کیا کبھی ایسا ہوا تھا؟ کیا ایسا ہوگا؟ ایسا ہوتا ہے دھرت راشٹر۔وہ سمجھتے ہیں وہی اس دھرتی کے پُتر ہیں...وہ اکثریت میں ہیں،اس لئے وہ اُنھیں اوران کی نشانی مٹا دینا چاہتے ہیں ۔انھوں نے پوری جاتی کوخوف زدہ کردیا ہے۔''

''زندگی کو ختم کرنا بہت مشکل ہے دھرت راشٹر۔زندگی کی جڑیں بہت گہری ہوتی ہیں۔کبھی سب کچھ ختم نہیں ہوتا۔کہیں کچھ بچ رہتا ہے۔وہی نجات کا مژدہ لے کر آتا ہے ...سنجے نے کہا ۔دھرت راشٹر نے چُپ سادھ لی،وہ بہت تھک گئے تھے۔ افسانہ۔'چکرویوہ'۔''دخمہ''۔ص۔۶۸،۵۹۔

۔''....وہ شہر گم کیسے ہوگیا؟

اتنا وقت گذر جانے کے بعد،اب سب کچھ صاف صاف نظر آرہا ہے۔وقت کو پہچاننے میں غلطی ہوئی تھی۔اس 'رہنما' کے سر میں ایک ہی سودا سوار تھا کہ'اس مملکت کو آزاد رہنا ہے'۔پھر تو انتہا پسند انقلابی لیڈر کی آواز بادشاہ سے اونچی ہوگئی۔لوگ اس کے اشاروں پر ناچنے لگے۔سیاست کی جگہ جذباتیت نے لے لی ۔حکمت کی جگہ جوشیلی تقریریں آگئیں۔سیاسی لڑائی کو مذہبی رنگ دے دیا گیا۔نیم فوجی دستے بنے۔نوجوانوں کو، خدا، مذہب اور قُران کے نام پر قربانی کے لئے تیار کیا گیا۔ریڈیو سے حُب الوطنی کے گیت بجائے جانے لگے۔جیالے نوجوان ٹینکروں کے سامنے لیٹ گئے۔بادشاہ کا فوجی کمانڈر اپنی فوج کے ساتھ تماشہ دیکھتا رہا۔ دیکھتے ہی دیکھتے،تیس ہزار لاشوں کو عبور کر کے'وہ لوگ' آگئے ۔ایک شرم ناک شکست؛ سب ختم ہوگیا۔ بلند بانگ دعوں کے ردِ عمل کے خوف سے ماں باپ نے اپنی بیٹیوں کو کنویں میں چھلانگ لگانے اور زہر کھانے پر مجبور کردیا۔ فوجی کمانڈر نے آگے بڑھ کر فاتحین کا استقبال کیا۔قُربانیاں رائگاں گئیں۔بادشاہ وقت نے انھیں غدار قرار دیا،آزاد مملکت کا خواب چکنا چور ہوگیا...تُرکی ٹوپیاں چھپا دی گئیں۔بعض افراد نے گھبرا کر گاندھی ٹوپی اوڑھ لی۔جسے ایک مضبوط قلعہ سمجھا جارہا تھا وہ ہوا کے ایک ہی جھونکے میں زمیں بوس ہوگیا۔''

افسانہ۔'درد کے خیمے'۔مشمولہ ''دخمہ ''۔ص۔۴۷،۳۷۔''امی ہمارا گھر کیوں نہیں ہے؟ زندگی نے اتنی مہلت ہی نہیں دی بیٹے۔امی نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

''پولس ایکشن نے ساری بساط الٹ دی۔دکن میں

مسلمانوں کے چھ صدیوں کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا، لاکھوں مسلمان مارے گئے، سینکڑوں خواتین نے خودکشی کر لی کسی کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو گا۔ اونچے درجے کے سرکاری ملازم علاحدہ کر دئے گئے یا ان کے عہدوں کو تنزلی دے دی گئی۔ جاگیرداری نظام ختم ہو گیا۔ ان اقدامات سے تنگ آ کر کئی ملازمین نے قبل از وقت ویفہ لے لیا...کچھ برس تک اسی تذبذب میں رہے کہ ، یہاں رہیں یا پاکستان چلے جائیں۔ اسی کشمکش میں گھر نہیں بنوایا ۔''افسانہ۔'رنگ کا سایہ'۔مشمولہ۔''دخمہ''۔ص۔۱۵۱

بیگ احساس کے شعور اور کچھ اجتماعی لاشعور میں متحرک ایسے سارے تلخ اور آتشیں حقائق کے اندر اور باہر جتنا کچھ بھی ہے اس میں سے مُٹھی بھر سچائیاں ہی بیگ احساس نے تمام تر فنی و جمالیاتی دروبست کے ساتھ کاغذ پر اتاری ہیں لیکن ان سب کی تفصیل، جدید مورخین، سیاسی رہنماؤں اور دانشوروں کی کتابوں میں بھی محفوظ ہیں۔ جنھیں جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ ایسے میں ہندوستان کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے بیدار مغز، سیکولر اور روشن خیال قلم کاروں کی طرح اردو کے جن گنے چُنے ادیبوں نے بلاخوف وخطر، بڑی بیبا کی سے، اپنے ادب میں، تمام تر فنی و جمالیاتی التزام کے ساتھ، تاریخی تناظر میں عصری حالات کی ریزہ کاری کی ہے ان میں بیگ احساس کا نام بھی نمایاں حیثیت کا حامل ہونے کا استحقاق رکھتا ہے۔ لیکن ''دخمہ'' کے افسانوں کی تفہیم وتعبیر کے لئے صرف افسانوی مجموعہ 'دخمہ'' ہی کافی نہیں۔ بلکہ فکری اور موضوعی رشتے رکھنے والے دیگر معاصر افسانہ (فکشن) نگاروں کے یہاں بھی جھانکنا ہوگا۔ قاری اساس تنقید کے بنیاد گذار مشہور جرمن دانشور وولف گانگ آئزر Wolfgang Iser نے بھی اپنی کتاب The Art Of Readig;ATheory Of Aesthetic Response.1978 میں لکھا ہے کہ ''کسی بھی ادبی تخلیق اور تخلیقی فن کار کی اہمیت اور معنویت کو تشفی بخش حد تک سمجھنے کے لئے معاصر ادیبوں کے ادب (متون) کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے''۔

اس زاوئے سے اگر بیگ احساس کے ''دخمہ'' میں شامل اکثر و بیشتر افسانوں کے فکری اور افسانوی زاویوں اور دائروں کو ذہن میں رکھیں تو بیگ احساس کے 'افسانوی فن' کے انفراد و امتیاز کے تعیُّن کے لئے ،صرف اور محض ''دخمہ'' کے افسانے ہی کافی نہیں ہوں گے، بلکہ وقت کے ساتھ بدلتی ہوئی 'افسانے کی شعریات کے علاوہ معاصر افسانہ نگاروں مثلاً، سلام بن رزاق (انجام کار) شوکت حیات (گنبد کے کبوتر) حسین الحق (نیو کی اینٹ) ذکیہ مشہدی (بھیڑئے) ساجد رشید (موت کے لئے ایک ا پیل) علی امام نقوی (خواہش معصوم) سید محمد اشرف (دوسرا بن باس) .وغیرہ کے افسانوں کے فکری و فنی ا متیازات ،نیز ، ۱۹۴۷ء. کے بعد اور خصوصاً ۲۰۱۴ء؛ میں ''ہندوتو وادی حکومت کے قیام کے بعد کے سیاسی، سماجی، مذہبی، قومی اور تہذیبی واقعات و سانحات اور تعصّبات و توقعات کو بھی ذہن میں رکھنا ہوگا، اور پھر اس کے ساتھ ہی بیگ احساس کی دوسری تحریروں، مضامین، 'سب رس' کے اداریوں، اہم شخصیات سے لئے گئے اِنٹرویوز، اور تنقیدی مقالوں اور مختلف موقعوں پر دئے گئے خطبات کے علاوہ اپنی ذات، حالات اور ادبی نظریات سے متعلق خود بیگ احساس کے افکار و خیالات کی آگہی بھی ضروری ہوگی۔

کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہندوستان میں منفی ا ور مثبت دانشورانہ (VISIONARY) سیاست اور علم و ادب کی باضابطہ شروعات ۱۸۵۷ء میں آزادی کھونے کے ساتھ ہی ہو گئی تھی۔ M.J.AKBAR نے اپنی کتاب TINDER BOX.the past and future of pakistan.p.222,23 میں لکھا ہے، ''۱۹۲۵ء.میں کیشو بلی رام ہیڈگوار کے ہاتھوں 'راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ' کے قیام ،۱۹۲۶ء.میں ایک کٹر جنونی مسلمانؑ عبدالرشید کے ہاتھوں سوامی شردھانند کے قتل، لالہ لا جپت رائے کا مہاتما گاندھی پر ہندوؤں کو کمزور کرنے کا الزام، ایم.اے .انصاری کا ''ہندو مسلم اتحاد پر اصرار ،مسلم لیگ کی ۱۹۴۰ء.میں مغربی اور مشرقی ہندوستان میں الگ الگ مسلم

ریاستوں، (بنگلیستان؛ بشمول آسام) عثمانستان؛ بشمول نظام حیدر آباد، اور مالا بار کے موپلستان) کے قیام کی تجویز، کے سبب ہندوستان میں میں جو ہلل پیدا ہوئی اس کی تان آخر کار تقسیم ملک پر ہی ٹوٹی۔ تب سے اب تک قوم کے پروانوں، ویرانوں اور گلستانوں پر کیا کیا گذری اور اپنے عہد کے حالات، مباحث اور خدشات وامکانات کے حوالے سے سرسید، علامہ اقبال، جمالالدین افغانی، رادھا کرشنن، امبید کر، گولوالکر سے لے کر مہاتما گاندھی، مولانا ابو الکلام آزاد اور پنڈت نہرو تک اور پھر آج کی تاریخ میں ''ہندوتو''، ''تہذیبی قومیت'' Cultural (Nationalism) کے حوالے سے آر.ایس.ایس اور اس کی حکمراں جماعت کے افکار ونظریات، آزاد ہندوستان کے ہم عمر معتبر معاصر افسانہ نگار، ادبی صحافی، نقاد اور ادب کے استاد بیگ احساس (پ۔۱۰.اگست. ۱۹۴۷ء.) اور ان کے معاصر افسانہ نگاروں، جوگندر پال، اقبال مجید، حسین الحق، شوکت حیات، مشرف عالم ذوقی، ذکیہ مشہدی، صدیق عالم، شائستہ فاخری اور نورالحسنین وغیرہ کے اجتماعی لاشعور کا حصہ ہیں۔

یہاں اس بات کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا کہ بیگ احساس نے الگ الگ وقتوں میں بیانیہ کو الگ الگ انداز میں بھی برتا ہے۔ ''حنظل'' سے لے کر ''دخمہ'' تک، بیگ احساس کے افسانوی اعمال نامے میں سادہ بیانیہ اور علامتی واستعاراتی افسانے بھی ملتے ہیں کئی افسانوں میں اساطیری یا دیومالائی اسلوب بیان بھی نظر آتا ہے لیکن مجھے بیگ احساس کے ادسانوی سرمایہ میں، نام نہاد جدیدیوں کی طرح محض فیشن کے پر لکھا گیا کوئی ''تجریدی'' افسانہ نظر نہیں آیا۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بیگ احساس نے ۸۰، ۷۰ کی دہائی میں جدیدیت کے رجحانات کے بعض اثرات ضرور قبول کئے ''۔حنظل'' میں ایسے جدید افسانے ہیں۔لیکن 'زمین ہو یا کاغذ' بیگ احساس ان جڑوں کے تحفظ کے قائل ہیں جن پر ذات، زندگی، معاشرہ اور ادب قائم ہے اس لئے ''حنظل'' کے جدید افسانوں میں بھی، تمام تر اجتہادی اور اختراعی رویوں کے باوجود مختصر افسانہ کی، فنی وتکنیکی، لسانی و جمالیاتی روایات ورسومات کا احترام ملتا ہے۔ 'دخمہ' کے افسانوں میں بھی جو انھیں سلام بن رزاق، مشرف عالم ذوقی، شوکت حیات، حسین الحق، صدیق عالم اور خالد جاوید وغیرہ کی طرح مابعد جدید فسانہ نگار ثابت کرتے ہیں بیگ احساس نے کہیں بھی انتہا پسندی سے کام نہیں لیا ہے ۔دخمہ' کے افسانے کسی بھی 'نظام (System) کی 'حتمیت' اور ہر طرح کی نظریاتی حد بندیوں سے ماورا، اکیسویں صدی کی مابعد جدید 'علمیات (Epistemology) فکریات (Discourses) اور 'بیانیات Narratology کے حامل افسانے ہیں۔دخمہ کے افسانوں میں بیگ احساس، کہانی، واقعات اور کرداروں کیساتھ، آزادانہ معاملہ کرتے نظر آتے ہیں جو مابعد جدید تصورِ ادب کا خاصہ ہے۔ 'دخمہ' کے افسانے عام معنوں میں قاری کو مسرت' یا بصیرت سے ہم کنار کرنے کے لئے نہیں لکھے گئے، کیونکہ ان افسانوں میں نہ تو کوئی آئیڈیالوجیکل پراپگنڈہ ہے ہے، نہ جنس کی چٹخارہٹ اور نہ اخلاقیات کا درس بلکہ ان کی جگہ عصر حاضر میں 'مسلّمہ نظام (SYSTEMS) اور انسانی اقدار وروایات کی شکستگی اور کھوکھلے پن کی بعض اُن سچائیوں کا بیان ہے جو بقول مرزا حامد بیگ حیران کُن ہیں،۔''بھگوا کرن'' کے دور میں 'مسلم ڈسکورس' کو اُجاگر کرنے اور ''مئے کدہ'' اور ''مسجد'' دونوں کو ایک ساتھ برتنے اور وطن پرستی کے جذبے کے ساتھ ملک کی سیکولر اور جمہوری قدروں کے مخالف افراد، اور عوامل بلا واسطہ وار کرنے کے لئے کلیجہ چاہئے۔

''ایک پوری قوم کو دہشت گردی کے جال میں پھنسا دیا گیا۔ایک آگ سی لگی ہوئی ہے جس میں پتہ نہیں کون کون ہاتھ سینک رہا ہے....اور بے وقوف قوم دلدل میں دھنستی ہی جا رہی ہے۔''..''مئے کدہ'' آپ نے کیوں بند کر دیا؟۔مسلمانوں نے حکومت سے شکایت کیکہ ''مئے کدہ''، ''مسجد'' سے بہت قریب ہے جو خلاف قانون ہے لیکن مسجد اور مئے کدہ برسوں سے اسی جگہ ہیں

پھر؟ وشاہی دور تھا۔اب جمہوریت ہے۔

میں نے شروع میں ہی کہا ہے کہ ''دخمہ'' کے افسانوں میں بحیثیت مجموعی ''سیاسی ،تہذیبی ،معاشی اورقومی بیانیہ'' کا غلبہ ہے۔اس ضمن میں معاشرہ،ملک اورقوم کے اجتماعی درد وکرب کی صورت گری کی گئی ہے۔اس کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ، بیگ احساس کے افسانوں میں ''تخلیقیت' اوردانشوری' کی لہریں ساتھ ساتھ چلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس کی عمدہ مثالیں 'دخمہ' میں شامل تقریباً سبھی افسانوں میں ملتی ہیں۔''چار پانچ برس میں کتنا کچھ بدل گیا ہے۔میوزک چیانلس کی اینکرس،آئٹم گرلس،ری مِکسنگ گرلس،جیسے ساری جوان لڑکیاں ننگی ہونے کو اٹاولی ہو رہی ہیں ۔شہرت پانے کا یہی شارٹ کٹ ہے۔ٹی.وی اور انگریزی میگزینوں اوراخباروں نے وقت سے پہلے بچوں کو ذہنی طور پر بالغ کردیا ہے۔ افسانہ۔''شکستہ پر''۔مشمولہ۔''دخمہ''۔ص:۱۱۱۔

''.....دیکھو دنیا کتنی بدل گئی ہے۔ایک سرکل پورا ہو رہا ہے۔انسان ماقبل تہذیب جانوروں کی طرح رہتا تھا۔ذاتی ملکیت کا کوئی تصور نہ تھا۔پھر ذاتی ملکیت کا تصور ابھرا۔خاندان بنا،قبیلہ بنا۔رشتے ناطے بنے۔وہ اپنا خاندان میں خوش رہنے لگا۔ پھر یہ خاندان بوجھ ہو گیا۔سنگل فیملی کا تصور ابھرا۔پھر وہ بھی سہار نہ سکا۔کنٹریکٹ میرج ہونے لگی....اب میرج بھی نہیں عورت اور مرد جب چاہتے ہیں جنسی تقاضے پورا کر لیتے ہیں۔

''اس کے باوجود بچے ہوتے ہیں اور کوئی احتیاطی تدبیر کام نہیں کرتی وہ بچے بھی جنم دیتے ہیں،اس نے تلخی سے کہا۔ ہاں،لیکن اس کا حل بھی انھوں نے ڈھونڈ لیا ہے۔ CHILD FARM ہونے لگے ہیں۔بچے کو وہاں چھوڑ دیتے ہیں۔''افسانہ۔''سنگِ گراں''۔مشمولہ۔دخمہ۔ص۔۴۱

بابا۔اس ملک میں دو ہی قسم کے لوگ پڑھ سکتے ہیں،ایک وہ جو غیر معمولی صلاحیت رکھتے ہوں اور دوسرے وہ جن کا تعلق پچھڑے طبقات سے ہو'' افسانہ۔کھائی؛مشمولہ۔''دخمہ''۔ص۔۵۳۔

''ہم نے تو اپنے ہی شہروں میں ہجرت کا کرب سہہ لیا۔وہ تہذیب سمٹ کر چند محلوں میں رہ گئی۔فصیل بند شہر کے دروازوں اور دیواروں کو توڑ کر شہر دور تک پھیل گیا۔سُرخ مٹی کو سیاہ مٹی سے جدا کر دیا گیا۔غذائیں بدل گئیں،لباس بدل گئے۔سڑکوں اور گلیوں کے اجنبی نام رکھ دئے گئے۔وہ جھیل جو کسی بزرگ کے نام سے موسوم ہے،وہاں ایک بُت نصب ہے۔وہاں مورتیاں ڈبوئی جاتی ہیں۔وہ پہاڑ جہاں نوبت بجائی جاتی تھی ،وہاں مندر کی گھنٹیاں بجتی ہیں۔لوگوں کا ایک ریلا یہاں آ کر بس گیا۔انھوں نے اپنی اپنی بستیاں اس شان سے بسا لیں کہ ہم سمٹ کر گندی بستیوں میں آ گئے۔شہر کا بدنما حصہ جسے کوئی نہیں پوچھتا''۔

افسانہ۔درد کے خیمے۔مشمولہ۔''دخمہ''ص۔۴۷۔''دخمہ''میں شامل ایک افسانہ''سنگِ گراں''،موضوع،اسلوب،اورتخلیقی رویہ کی بنا پر ''سماجی وثقافتی تانیثیت (Socio.Cultural Feminism کے حوالے سے منٹو کے''کھول دو''بیدی کے''لاجونتی'' اور غلام عباس کے''آنندی'' کے قبیل کا افسانہ ہے۔آج کی ایک تعلیم یافتہ'،شادی شدہ'ورکنگ' عورت کی خود اپنے ہی ہاتھوں اپنی ممتا کا گلا گھونٹتی ہے ماں بنے کی جبلی خواہش اور معاشی تنگ دستی کے جبر کی کش مکش میں ممتا ہار جاتی ہے۔ابارشن کروا لینے کے بعد بھی پیدا نہ ہونے والے کی آواز''ممی ممی...ہمہ وقت اس کا تعاقب کرتی رہتی ہے۔افسانہ'سنگ گراں''میں زبان ،بُنت اور بیانیہ کے حوالے سے بیگ احساس کی فن کاری اپنی انتہاؤں کو مس کرتی نظر آتی ہے۔ اس افسانہ کے ایک دو ساختیوں سے،بڑے شہروں کے معاشی جبر سے پیدا ہونے نفسیاتی اوراخلاقی بحران کا انداز ہ لگایا جا سکتا ہے ۔''گھر سے نکلی تو بہت سنبھل سنبھل کے قدم رکھے.....دن بھر میں کئی بار اس نے وہ باریک سی آواز سنی۔ممی۔ممی؛''دونوں نے شادی تو کر لی تھی لیکن ان کا اپنا کوئی گھر نہیں تھا۔رات وہ اسے چھوڑ کر لوٹ جاتا۔آج اس کا کتنا جی چاہا کہ اس کا اپنا گھر ہوتا وہ سیدھے اپنے گھر جاتے پھر وہ اپنی ساڑی ہٹا کر اپنا پیٹ ننگا کر دیتی اوراس سے کہتی کہ،اپنا کان اس کی ناف سے لگا کر،وہ باریک سی آواز سنے ....ممی.....اس کا دل بھر آیا۔بیٹا،ہماری دنیا

ایسی نہیں ہے کہ تم آؤ۔ دیکھو ہمارا اپنا کوئی گھر نہیں ہے۔ میری اور تمہاری دیکھ بھال کون کرے گا؟ جب میں جاب کرنے چلی جاؤں گی تو تم اکیلے کیسے رہو گے؟

''ممی۔ممی۔'' ایک آواز آتی رہی۔

ابارشن ہو جاتا ہے لیکن ''ممتا'' زندہ رہتی ہے۔ اور وہ سب کچھ جانتے سمجھتے بھی اپنے آپ کو اس فریبِ نشاط میں مبتلا رکھتی ہے کہ ''شاید وہ محفوظ ہے۔ کوئی قافلہ ادھر سے گذرے گا تو اسے باہر نکالے گا۔... پھر وہ قید خانے سے معبر بن کر نکلے گا۔ اس وقت تک وہ بینائی کھو چکی ہوگی۔ اس کا بیٹا اسے اندھیروں سے نکالے گا۔''

''دخمہ'' کے حوالے سے بیگ احساس کے فن کے انفراد و امتیاز کو سمجھنے کے لئے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ، آزادی کے بعد سے ،۷۰،۱۹۶۰ء. کے آس پاس تک اردو فکشن (ناول اور افسانہ) کے بیانیہ پر ''واقعاتی دستاویزیت'' (DOCUMENTATION) کا غلبہ رہا۔ خدا کی بستی (شوکت صدیقی) سے لے کر آگ کا دریا، آخرِ شب کے ہم سفر (قرۃ العین حیدر) غدار (کرشن چندر) اور انسان مر گیا (رامانند ساگر) بہت دیر کر دی (علیم مسرور) لہو کے پھول (حیات اللہ انصاری) جیسے ناولوں اور ٹوبہ ٹیک سنگھ، کھول دو (منٹو) 'لاجونتی' (بیدی) 'پیشاور ایکسپریس' (کرشن چندر) سردار جی (خواجہ احمد عباس) اور یا خدا' (قدرت اللہ شہاب) وغیرہ جیسے افسانوں کی دستاویزیت نے اردو افسانہ کو ترقی پسند افسانہ سے الگ ایک نئی شعریات سے روشناس کروایا۔ لیکن اس نئی شعریات کا اردو افسانے کی روایت سے رشتہ قائم بھی رہا۔ ''نصیر اور خدیجہ (راشد الخیری۔۱۹۰۳ء.)' ایک پرانی یوار، (علی محمود۔۱۹۰۴ء) غربت و وطن (سجاد حیدر یلدرم ۔۱۹۰۴ء) نابینا بیوی (سلطان حیدر جوش (سجاد حیدر یلدرم.۱۹۰۷ء.) اور 'عشق دنیا اور حُبِ وطن (پریم چند.۱۹۰۸ء.) وغیرہ ابتدائی افسانوں میں، فنی و تکنیکی، لسانی و موضوعاتی اعتبار سے، تکثیری روایت ضرور سامنے آئی تھی۔ لیکن ان افسانوں کا، مزاج کے اعتبار سے، معاشرہ کے مسلمہ تہذیبی و اخلاقی نظام سے گہرا رشتہ بھی تھا۔ البتہ اسلوب کے معاملے میں سجاد حیدر یلدرم کے یہاں جو 'اختراع پسندی ہے وہ انھیں دوسرے ابتدائی افسانہ نگاروں سے الگ کرتی ہے۔ دنیا کا انمول رتن (پریم چند۔۱۹۰۸ء.) سے لے کر 'کفن' (پریم چند) اور ''ستاروں سے آگے'' (قرۃ العین حیدر.۱۹۴۷ء.) کے آس پاس تک، نیاز فتح پوری، چودھری محمد علی، سدرشن، سہیل عظیم آبادی، غلام عباس، منٹو، بیدی، کرشن چندر اور خواجہ احمد عباس وغیرہ نے جو حقیقت پسندانہ، رومانی، اور نفسیاتی افسانے لکھے ان میں بھی نمایاں طور پر ''واقعاتی بیانیہ'' کو ہی برتا گیا۔ البتہ اس دوران ''انگارے' عزیز احمد اور احمد علی کے افسانوں نے اردو افسانہ کی روایت میں امکانات کے نئے 'در' روشن کرنے کی کوششیں ضرور کیں۔ ظاہر ہے کہ اردو افسانے کی ہیئتی، تکنیکی، موضوعاتی اور اسلوبیاتی کروٹوں کا یہ پورا منظر نامہ اردو زبان و ادب کے استاد، بیگ احساس کے تخلیقی شعور میں جذب ہے اس کا اندازہ ان کے افسانوں کے علاوہ ان کی دیگر تحریروں اور روزمرہ کی ادبی گفتگو سے بھی ہوتا ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ، ۱۹۶۰ء. کے آس پاس سے لے کر ۸۵،۸۰ تک جب اردو ادب پر 'جدیدیت' کی بالادستی قائم تھی، بیگ احساس کے بعض 'سینئر افسانہ نگاروں کی 'تخلیقیت' (Creativity) پر جدیدیت کے رجحان کے، مثبت سے زیادہ منفی اثرات مرتب ہوئے۔ اس دوران '' پورٹریٹ اِن بلیک اینڈ بلڈ (بلراج مینرا) تلتقارمس (سریندر پرکاش) ''انٹرا موراسس'' (ظفر اوگانوی) سے لے کر ''گبرولا'' (احمد ہمیش) تک اور پھر ''بے سر کا گوتم'' (رام لعل) سے لے کر ''پرندہ پکڑ نیوالی گاڑی'' (غیاث احمد گدی) تک اردو افسانہ میں 'بیانیہ کے جتنے SHADES سامنے آئے، اور جس کیوجہ سے، ۷۰،۶۵ کے عرصے میں اردو افسانہ اسلوب و بیان کے حوالے سے ''کنفیوژن'' کا شکار ہو گیا۔ یہاں تک کہ افسانہ میں ''افسانویت'' (کہانی پن) کے وجود کو ہی غیر ضروری قرار دینے کوشش کی گئی۔

رشیدامجد نے افسانویت کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا تھا،''لفظ 'افسانویت' بوڑھے نقادوں کا جمایا ہوا لفظ معلوم ہوتا ہے ،جس کے میرے نزدیک کوئی معنی نہیں'' اور کمار پاشی نے تو جوش جنوں میں یہاں تک کہہ ڈالا تھا کہ ''جدید افسانہ نگاروں نے افسانے کو 'افسانہ پن' (کہانی پن) سے نجات دلا کر اسے تخلیقی ذائقہ سے روشناس کرایا ہے۔'' دلچسپ بات یہ ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی افسانہ کو ایک 'تھرڈ کلاس صنف' قرار دیتے ہوئے اردو میں افسانہ کی کسی وایت کے وجود کو ہی ماننے سے انکار کیا ۔وہاب اشرفی نے 'شب خون'' میں ہی ،دلائل کے ساتھ ایسے سارے مفروضات کو باطل ثابت کیا۔حتیٰ کہ کچھ عرصہ بعد خود رشید امجد اور کمار پاشی ہی نہیں فاروقی بھی 'کہانی پن اور افسانے کی روائت سے متعلق اپنے سابقہ موقف سے تائب ہو گئے پھر بھی کم و بیش ایک دہائی تک، بعض نام نہاد جدید افسانہ نگار ،علامتی ،استعاراتی اور تجریدی افسانہ کے نام پر ،اردو افسانہ کا ''چیر ہرن'' کرتے رہے۔

بیگ احساس کو اردو افسانہ کی ان ساری کروٹوں کا شدت سے احساس تھا۔اور چونکہ توازن وتناسب ،صبر وسکون اور منطقی غور وفکر بیگ احساس کی شخصیت کے شناختی امتیازات رہے ہیں ، اسلیئے جدیدیت کے ابتدائی دور میں بھی،''افسانہ کی شعریات'' (فن،تکنیک، اسلوب ،اور موضوع) کے حوالے سے جو کنفیوژن آج کے معتبر اوراُ ن دنوں کے نئے افسانہ نگاروں،شوکت حیات ،حمید سہروردی،قمر احسن ......وغیرہ کے یہا ں نظر آتا ہے وہ 'کنفیوژن' بیگ احساس کے یہاں نہیں ملتا۔اس جدیدیت کے عروج کے زمانے میں بھی بیگ احساس نے ''حنظل''،' 'آسماں بھی تماشائی ،کرفیو'خس آتش سوارِ...... جیسے افسانے لکھے، جو جدید ترین االسلوبیاتی رویوں کے باوجود افسانے ہیں، جگلری نہیں ، البتہ سریندر پرکاش (تلقارمس) ظفر اوگانوی (انٹرا موراسس) گبرولہ (احمد ہمیش)وغیرہکیطرح افسانے کا غیر مانوس ،چونکانے والا عنوان رکھنے کے 'فیشن'' کا اثر بیگ احساس کے یہاں بھی ملتا ہے۔لیکن اکیسویں صدی تک آتے آتے ،بحیثیت افسانہ نگار بیگ احساس کا قد، ہرزاوئے سے اپنے معاصر افسانہ نگاروں سے بہت نکلتا ہوا نظر آتا ہے۔بہر حال ''دخمہ'' (۲۰۱۵) کے افسانے یہ ثابت کرتے ہیں کہ،

ا۔ بیگ احساس کسی بھی سکہ بند رجحان یاتحریک ،نظریہ یا آئیڈیالوجی سے ماورا ایک آزاد طبع افسانہ نگار ہیں۔

۲۔ بیگ احساس اپنے افسانوں میں اکیسویں صدی کی (تعمیری یا تخریبی) فکریات کو،سابقہ روایات واقدار کے زیر سایہ بیان کرتے ہیں۔

۳۔ 'دخمہ' ،سنگِ گراں' 'درد کے خیمے،اور ''سانسوں کے درمیاں' جیسے افسانے ،کارپوریٹ کلچر اور گلوبلائزیشن کے ماحول میں ہی لکھے جاسکتے ہیں۔

۴۔بیگ احساس افسانوں کے موضوعات اپنے آس پاس کی زندگی کے سیاسی وسماجی اور تہذیبی ،اور معاشی کشاکش سے کشید کرتے ہیں اورانھیں ،شعوری یا لاشعوری طور پر مابعد مارکسی جمالیات (Post Marxist Aesthetics) کے مطابق بیان کرتے ہیں۔

۳۔ بیگ احساس کے افسانوں میں، واقعات وکیفیات کے حوالے سے اپنے کرداروں کے شعوراور لاشعور میں جھانک کر ان کے Impersonal Narration کا طریقہ کار ملتا ہے۔

۴۔ بیگ احساس کے اکثر افسانوں کا محل وقوع حیدر آباد ہے۔لیکن واقعات وکیفیات کے حوالے سے بیان کا انطباق لکھنو ممبئی اور کشمیر پر بھی ہوسکتا ہے۔

۵۔ بیگ احساس کے (اکثر) فسانوں میں حیدر آبادی الفاظ و محاورات کے برمحل لسانی برتاؤ سے افسانے میں ارضیت کی کشش پیدا ہوتی۔

٦۔ بیگ احساس اپنے افسانوں کا اختتام عام طور پر قاری کی توقع کے خلاف کرتے ہیں۔اس مہارت کے ساتھ کہ قاری اس اختتامی موڑ سے ،خود کہانی میں نئی جہات پیدا کر کے افسانہ کے تخلیقی عمل میں شریک ہوجاتا ہے۔

۷۔ دخمہ کے بعض افسانوں مثلاً ''نمی دانم ..... میں ،ریٹائر ہونیوالے یونیورسیٹی پروفیسر کے حوالے سے خود بیگ احساس کے سوانحی حالات کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔

۸۔ بیگ احساس ، روائتی موضوعات کی طرح کسی بندھے ٹکے اسلوب کی پابندی سے بھی گریزاں رہتے ہیں ۔اسی لئے دخمہ میں سادہ،عام فہم اور استعاراتی افسانے بھی ہیں ،ساتھ ہی وہ ضرورت کے مطابق کہیں ہندو دیو مالا تو کہیں اسلامی اساطیر سے بھی استفادہ کرتے ہیں ،جو ان کی شخصیت کی وسیع النظری کی دلیل ہے۔

۹۔'' دخمہ کے افسانوں کی زبان دل میں اتر جانے والی فطری زبان ہے جو ان کی شخصیت کی نفاست اور ، ماحول کی تہذیب و شرافت کی غماز ہے۔ماہرانہ لسانی برتاؤ کے سبب،الفاظ وتراکیب، بیگ احساس کے جذبہ واحساس ،تجربہ ومشاہدہ اور موضوع سے متعلق فکر ونظر کا ساتھ دیتے ہیں۔

۱۰۔ نثر کی شعریات اور اردو کے مختلف النوع اسالیب نثر کی کماحقہہ آگہی کے باوجود عام طور پر بیگ احساس مروجہ،عام فہم اردو لفظیات (LANGUE) کا استعمال کرتے ہیں اور اسی لانگ کے ذریعے اپنے افکار وخیالات کا اظہار ،اور متنوع بیانیوں Narrations کی تعمیر کرتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ قاری کو بیگ احساس کے افسانوں کے جہان معنی وتاثر میں داخل ہونے میں دشواری نہیں ہوتی۔''چونکہ بیگ احساس کے افسانے عام طور پر قومی،سماجی،اور تہذیبی بیانیہ کا حکم رکھتے ہیں۔اس لئے بیگ احساس کے افسانوی مجموعہ''دخمہ'' کے حوالے سے مزید دو باتوں کا ذکر ضروری بن جاتا ہے:۔ اول یہ کہ بیگ احساس نے 'دانستہ ور پر ''دخمہ'' کا دیباچہ مرزا حامد بیگ سے لکھوایا ہے۔اچھا کیا،لیکن چونکہ اردو افسانہ کے اس سب سے معتبر محقق اور نقاد حامد بیگ نے اپنے دیباچے میں ہندوستان میں اردو افسانہ کی رفتار اور معیار پر بھی ایک اُچٹتی نظر ڈالی ہے اس لئے انھیں یاد دلانا ضروری ہے کہ آج ۲۰۱۸ء میں پاکستان میں شاعری تو بے حد عمدہ ہو رہی ہے لیکن افسانے ہندوستان میں زیادہ بہتر لکھے جا رہے ہے ہیں۔البتہ ہندوستان میں، وارث علوی کے بعد ارتضی کریم کے سوا اور کوئی نہیں ہے جسے اردو افسانہ (فکشن) کا معتبر محقق اور نقاد گردانا جا سکے۔ مہدی جعفر کی آمد بڑے طنطنے سے ہوئی تھی لیکن اچھی اُٹھان کے باوجود جانے کیوں افسانہ پر ان کی گرفت کچھ ڈھیلی پڑ گئی۔۔کچھ نئے ناقدین نے بھی افسانے کی تنقید کا شوق پورا کیا ،لیکن وہ''طاؤس چمن کی مینا'' اور گیبریل گارشیا مارکیز سے مستعار جادوئی حقیقت نگاری Magical Realism کی بھول بھلیوں میں ہی الجھ کر رہ گئے ۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہندوستان کے دو معتبر فکشن نگاروں،حسین الحق اور مشرف عالم ذوقی نے،اردو افسانے کا نئے زاویوں سے جائزہ پیش کرنے میں کہیں زیادہ،فکری تازہ کاری اور تعمیری وژن کا ثبوت دیا ہے۔گوپی چند نارنگ تو 'جگت گرو' ہیں''فکشن شعریات ؛تشکیل وتنقید'' میں اگر شافع قدوائی کا 'مقدمہ' نہ بھی ہوتا تو اس کتاب میں شامل مضامین،معاصر اردو افسانہ کی شعریات، کی نئی گذرگاہوں کی آگہی کے لئے کافی تھے ۔(اللہ ان کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رکھے) لیکن ان کے بعض مضامین کے عنوانات،معنی خیز ہونے کے باوجود کسی بوڑھے بچے کی اٹکھیلیاں لگتے ہیں۔مثلاً''منٹو کی نئی پڑھت؛متن،ممتا اور خالی سُنسان ٹرین''۔''ساجد رشید؛مہانگری ،زیر ناف اور سماجی ڈسکورس''۔''جابر حسین کی آلوم لاجاوا اور ٹال کی مرنی''۔وغیرہ۔اسی طرح شمس الرحمٰن فاروقی نے''افسانے کی حمائت میں''،افسانہ کو 'تھرڈ کلاس صنف قرار دینے کی جو حماقت کی تھی اس کا ازالہ کرنے کے لئے وہ خود افسانہ نگار (بلکہ ناول نگار بھی) بن بیٹھے ،(سوار،کئی چاند تھے سر آسماں) لیکن اس کے باوجود نارنگ اور فاروقی صاحبان ہمارا قیمتی سرمایہ ہیں ۔ان کو سر آنکھوں پر بٹھائے رکھنا اردو والوں کی مجبوری ہے کہ اردو ادب اور ادیبوں کا بھلا کرنے کا اختیار تو ان کے پاس ہی ہے۔ان دونوں 'پیران پارسا' نے فکشن تنقید کیا ، اردو تنقید کی جماعت میں ہی''دوسری صف'' کے لئے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ہے۔حالانکہ بحیثیت مجموعی

اب اردو میں ان سے بہتر کہنے اور سننے والے بھی اپنی موجودگی درج کروا چکے ہیں، کسی کو خبر ہو کہ نہ ہو۔

بہر حال مرزا حامد بیگ اور افسانہ کے نئے ناقدین کے حضور میں اپنا یہ معروضہ بھی پیش کرنا چاہوں گا کہ بیگ احساس کے افسانوں کے ساتھ ساتھ اگر، مشرف عالم ذوقی، سلام بن رزاق ،حسین الحق، شوکت حیات ،علی امام نقوی، خالد جاوید ،ترنم ر یاض، شائستہ فاخری اور احمد صغیر سے لے کر صدیق عالم اور شہناز رحمٰن تک کے افسانوں کے مزاج و منہاج کو ذہن میں رکھیں تو یہ ماننا ہوگا کہ آج کی تاریخ میں دخمہ (بیگ احساس) ایک مُردہ سر کی حکایت (ساجد رشید) ''صلیب'' (سلام بن رزاق) نیو کی ا ینٹ' (حسین الحق) بوڑھے جاگ سکتے ہیں (مشرف عالم ذوقی) ''گنبد کے کبوتر (شوکت حیات) ٹھہر جانے والا منظر (عبد الصمد) شہر (ترنم ریاض) سنگھار دان (شموئل احمد) برے موسم میں (خالد جاوید) حد کوئی چاہئے عقوبت کے واسطے'' (لالی چودھری) نیم پلیٹ (طارق چھتاری) انا کو آنے دو (احمد صغیر)''الزورا'' (صدیق عالم) راستے بند ہیں (اسرار گاندھی) اور ''ستیہ وان'' (شہناز رحمٰن) جیسے آج کے افسانوں کو سامنے رکھیں تو ماننا پڑے گا کہ اب، افسانہ کی تخلیق کا انحصار افسانہ نگار کے ''وژن'' پر ہوتا ہے۔ کہانی، کردار، واقعات اور اسلوب کی اہمیت ثانوی ہو گئی ہے ۔ در اصل ، کسی بھی صاحب نظر افسانہ نگار کی تخلیقیت Creativity جب کسی بھی داخلی یا خارجی سبب سے متحرک ہوتی ہے اور وہ افسانہ نگار اس سبب 'موٹف' کے حوالے سے ایک تازہ فکر یا وژن کی تشکیل کرتا ہے اور پھر اس موٹف اور اس کے انسلاکات کے تار و پود کے زائیدہ بیانیہ کو تہہ دار، اور تکثیری فنی و جمالیاتی در و بست اور معنوی ترتیب و تسلسل کے ساتھ سادہ یا استعاراتی اسلوب میں پیش کرتا ہے تو اسے افسانہ کہتے ہیں جو سابقہ کہانی سے رشتہ رکھنے کے باوجود ،پُرانے معنوں میں کہانی نہیں، نئے مفہوم میں ''افسانہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں 'بیانیہ' کی دوسری صورتوں کی طرح ''افسانہ' میں بھی کہانی، کردار، واقعہ اور اسلوب کو برتا تو جاتا ہے لیکن مابعد جدید فکریات (ڈسکور سیز) کے اس دور میں، ذات، زندگی اور زمانہ کی طرح، بیانیہ بھی نئے قالب میں ڈھل چکا ہے ۔ Short.Story اب پریم چند کیا منٹو، بیدی، اور کرشن چندر (پُھندنے' کو کھ جلی اور غالیچہ' وغیرہ سے قطع نظر) کی کہانیوں کے دور سے بہت آگے نکل چکا ہے۔ لہذا اب بیگ احساس اور ان کے معاصرین کے'' مختصر نثری بیانیہ' Short ProseNarrative' کو' کہانی کے بطور نہ تو پڑھا جا سکتا ہے نہ سمجھا جا سکتا ہے۔ گویا غلط یا سہی میں یہ کہنا چاہ رہا ہوں کہ منٹو اور بیدی کی کہانیاں ہوں یا بیگ احساس اور سلام بن رزاق کے افسانے، بے شک ''بیانیہ'' کی ہی صورتیں ہیں پھر بھی کل کی کہانی اور آج کے افسانہ میں فرق ہے۔ اس فرق کو اس طرح بھی واضح کیا جا سکتا ہے کہ راوی یا بیان کُنندہ، کردار سے جُڑے واقعہ (کہانی) کو مرکز میں رکھ کر فنی و جمالیاتی، منطقی اور معروضی ربط و تسلسل کے ساتھ، جذبہ و احساس پر مشتمل جو سادہ بیانیہ وضود میں لاتا ہے وہ ''کہانی'' کہلاتا ہے۔ لیکن اس کے برعکس ،جب کردار یا واقعہ کی نفسیاتی، قومی، تہذیبی، سماجی یا سیاسی تہوں اور طرفوں کے حوالے سے فکر و دانش (وژن) کے موضوعی (Subjective) در و بست کے ساتھ، سادہ (درد کے خیمے ،نجات)، استعاراتی یا علامتی (سنگِ گراں، سانسوں کے درمیاں ،شکستہ پر، دھار، سلوب میں کوئی بیانیہ تشکیل پذیر ہوتا ہے تو اسے افسانہ کہنا مناسب ہوگا۔

اب چونکہ ہم ''دخمہ'' کے حوالے سے بیگ احساس کی تحریروں کو' کہانی کے بجائے 'افسانہ' قرار دینے کی جسارت (یا حماقت) کر ہی رہے ہیں تو بات ذرا اور دور تلک جائے گی ۔ حالیہ برسوں میں Narratology کے حوالے سے ٹٹاروف۔ رولاں بارتھ، اور باربرا اسمتھ کے ساتھ ساتھ اردو میں شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، محمد حمید شاہد، احمد سہیل، ارتضیٰ کریم، عبد الصمد، مشرف عالم ذوقی، شوکت حیات، قاضی افضا ل حسین اور سکندر احمد سے لے کر احمد صغیر، اقبال حسین آزاد، شائستہ فاخری اور

خود بیگ احساس وغیرہ نے 'اکیسویں صدی کی تیزی سے بدلتی، بگڑتی ہوئی سماجی ،تہذیبی اور اخلاقی اقدار کے حوالے سے ادب، فکشن ، ،واقعہ،وقوعہ،وقائع، Event ،صورت حال،کردار راوی(Narrator)بیان۔بیانیہ،کہانی،کہانی پن،اور'افسانہ اور افسانویت سے متعلق جو نئے مباحث سامنے لائے ہیں۔ان سے بھی وقتی طور پر یہی نتیجہ برآمد ہورہا ہے کہ'کہانی'اور'افسانہ'دونوں ہی بیانیہ تو ہیں لیکن دونوں کے الگ الگ شناختی امتیازات بھی ہیں۔کہانی میں کردار کے اعمال وحرکات اور واقعات کو روائتی فنی و تکنیکی التزام اور ترتیب وتسلسل کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔جب کہ''افسانہ''میں،اصلاً کردار سے جُڑے واقعات و کیفیات اور اعمال ومحسوسات کی بنیاد پر قائم ہونے والی'بصیرت یا وژن' کو غیر روائتی،اجتہادی فنی وتکنیکی،اسلوب میں بیان کیا جاتا ہے۔سوا سیر گیہوں(پریم چند)بیگو(منٹو)بھولا(بیدی)کالو بھنگی(کرشن چندر)وغیرہ،کہانیاں ہیں لیکن انھیں کی تحریریں'کفن،ٹوبہ ٹیک سنگھ ،لاجونتی اور دو فرلانگ لمبی سڑک وغیرہ افسانے ہیں۔گویا کہانی میں کردار اور واقعہ کی مدد سے کہانی کار کا جذبہ و احساس اور سوچ اور نظریہ کا بیان بندھے ٹکے مروجہ انداز میں ہوتا ہے۔جب کہ ''افسانہ''میں افسانہ نگار کسی بھی داخلی یا خارجی محرک(موٹف)کو اپنی'تخلیقیت'میں جذب کرکے پہلے اس موٹف سے متعلق ایک ''وژن''قائم کرتا ہے اور پھر کردار اور واقعات و کیفیات کی مدد سے ،اپنے اس وژن کو من چاہے اسلوب میں بیان کرتا ہے ۔دوسری بات یہ کہ کہانی میں،کہانی کار اپنے کردار کا حامی یا مخالف ہوتا ہے یا پھر کردار سے وابستہ کسی عمل،واقعہ یا کیفیت کا محض راوی،یا بیان کنندہ۔لیکن افسانہ میں،افسانہ نگار کردار سے جُڑے واقعہ یا کیفیت کا محض راوی،واقعہ نویس یا بیان کنندہ نہیں ہوتا بلکہ ان کے حوالے سے قوم،سماج،سیاست اور تاریخ وتہذیب کو مجروح اور شکستہ کرنے والے منفی اور مسموم،فکریات،نظام اور روایات کو مثبت،تعمیری،رنگ دینے والا صاحب نظر،وژن کا حامل ایسا Focalizer یا دیدہ ور تخلیق کار ہوتا ہے،جو اپنے'وژن'کے وسیلے سے افسانہ کے بیانیہ کے معنی ومفہوم اور غرض وغائت کی جہات اور امکانات کو بھی منور کرتا ہے اور اس کے افسانوں کا تعمیری کردار بھی سامنے آتا ہے۔ ،اس زاویے سے بیگ احساس کے افسانوی مجموعہ''دخمہ'' میں شامل'مختصر نثری بیانئے(Short prose Narratives کہانیاں نہیں''افسانے ہیں جو''دخمہ'' میں برہنہ پڑی نعش پر منڈراتے گِدھوں کی طرح،اقلیتوں اور دلتوں کی تاریخ وتہذیب کو نوچ کھانے پر آمادہ عناصر سے تحفظ کا''وِژن'' بخشتے ہیں۔آج کے حالات،وقت گذاری یا دل بہلانے والی کہانیوں کی بجائے بیگ احساس کے ''دخمہ'' میں شامل تحریروں کی طرح Visionary افسانوں کا ہی مطالبہ کرتے ہیں۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

کے نامور شخصیات پر لکھے گئے مضامین

کا مجموعہ

افاداتِ زور

(جلد چہارم)

مرتب

سید رفیع الدین قادری

ملنے کا پتہ:

زور فاؤنڈیشن،زور کامپلکس،پنجہ گٹہ حیدرآباد

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،نئی دہلی۔۶

ایوانِ اردو،پنجہ گٹہ روڈ،سوماجی گوڑہ،حیدرآباد۔۸۲

مضمون

فیاض رفعت

حمید سہروردی سفر مدام سفر کا افسانہ نگار

افسانے کی بہت سی تشریحات اور توضیحات کی جاتی رہی ہیں اور یہ سچ بھی ہے کہ افسانہ اپنا پیرہن بدلتا رہا ہے۔ایک زمانہ تھا کہ اس کا اختتامیہ تحیر پر ہوتا تھا۔اسرار انگیزی اور حیرت زدگی بھی افسانے کا جزو لانیفک رہے ہیں۔ایک وقت تھا جب پلاٹ پر زور دیا جاتا تھا۔بعض لوگوں نے مکالمہ آرائی سے افسانے کے تار و پود کو حرارت بخشی مغربی تکنیک کے پیش نظر افسانہ کو نئی زیبائش و آرائش بخشی گئی۔موپاساں، او۔ہنری، سمرسٹ مام نے افسانے کی بنت میں تجرباتی ٹکنیک استعمال کرنے کے باوجود چونکاتے رہے اور اختتامیہ پر زور رہا۔

ورجینا اور میلان کندیرا کے اثرات کے تحت مشرقی افسانہ نگاروں نے پلاٹ سے زیادہ خود کلامی سے سخن سازی کا کام لیا۔سارتر نے اپنی تخلیقات میں وجودیت کے فلسفۂ ہائے زندگی کو تب و تاب بخشی۔رڈیارڈ کپلنگ نے انسانی فطرت اور نفسیات کو نئے رموز و نکات سے آشنا کیا۔مشرقی ماحول سازی میں جن افسانہ نگاروں نے اُن سے افسانے کے آداب سیکھے اور سلیقہ شعاری کے ساتھ اپنے کرداروں میں بطریق احسن برتا۔ان کے ظاہر سے زیادہ اندرونی سطح پر تہہ در تہہ تعبیرات پیش کیں۔اُن میں حمید سہروردی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے اپنے افسانے کو لفظوں کی ایسی رنگولی سجائی۔جس کے رنگوں کی شناخت اور پہچان کے لیے دیدۂ بینا کی ضرورت پڑتی ہے۔ان کے افسانوں کی طلسمی دنیا ہمیں اپنی طرف ایک محبوبہ کی طرح راغب کرتی ہے اور سامری کے جادو کی طرح ہمارے حواسِ خفتہ کو گدگداتی اور سہلاتی ہے۔

سفر مدام سفر اُن کی کہانیوں کا حاوی استعارہ ہے۔مگر یہ سفر تاریکی کا سفر ہے۔دھند چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے چلتے چلتے پاؤں زخموں کے بوجھ سے خونچکاں ہو چلے ہیں۔غبار ہے کہ بڑھتا پھیلتا جا رہا ہے۔نقش قدم نظروں سے اوجھل ہو چکے ہیں۔کچھ نظر نہیں آتا۔جو فریبِ نظر ہے۔میں کا احساس شدید ہو کر ذاتِ واحد کا روپ دھار لیتا ہے۔میں کا وجود سات سماوات کا حصہ بن جاتا ہے۔جہاں بدلیوں میں نجات کی کہکشاں بڑھتی پھیلتی جا رہی ہے۔جہاں جسم سے آزاد ملکوتی روحیں رقص کناں بدلیوں کے ساتھ سرگوشیاں کر رہی ہیں اور خالق کائنات کی حمد و ثنا کی آوازوں کی لے بڑھتی جا رہی ہے۔بسیط فضا میں پھیلتی جا رہی ہے۔

حمید سہروردی نے خونبار شہر کی فگار اُنگلیوں سے لہو ٹپکتے ہوئے دیکھا ہے۔شہر کی روح زخمی ہے یا پھر تخلیق کار کو اُس کا گمان ہوتا ہے۔جس نے انگلیاں خون میں ڈوبی ہیں اور روح میں بوند بوند پھیلتے ہوئے۔نیل زہر کو نیل کنٹھ کے مانند منتھن کر کے تریاق میں تبدیل کر رہا ہے کہ گناہوں کی پھیلتی پھولتی کھیتی پر قدغن بٹھایا جا سکے۔

حمید سہروردی کے افسانوں کے کرداروں کا تجزیہ کیا جائے تو منکشف ہوتا ہے کہ وہ اپنی ارضیت کے باوجود ایک عجب سے روحانی کشف کے اسیر ہیں۔وہ اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی خود آگہی کے کیف میں ڈوبے ہوئے مستانہ وار زندگی کر رہے ہیں۔کلبیت کے شکار ہوتے ہوئے بھی وہ فی النہار جہنم کے عقیدہ میں یقین رکھتے ہیں وہ حیات و ممات کی شکست و ریخت کو انسان کا مقدر جانتے ہیں۔ماحول سازی کی کنایت حمید سہروردی کی پہچان اور شناخت ہے بھی اور نہیں بھی کلی طور پر جو اجزائے ترکیبی کی بنت حمید کی سخن سازی کا پتہ دیتی ہے وہ خاموشی کے سات پردوں میں مخفی ہوتے ہوئے بھی اپنے رنگوں کی روشنی چھوڑ جاتی ہے۔بعض تجرباتی افسانوں میں مصنف کہیں نظر نہیں آتا۔تمام تر کردار

اپنا ایک علاحدہ تشخص قائم کرتے نظر آتے ہیں۔ جسے آپ فریب نظر سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ وہ مصنف کی ذات سے خود کو جدا کر کے اپنا ایک الگ وجود قائم کرتے ہیں یا پھر ایسا گمان ہوتا ہے۔ مصنف مصنف نہ ہو کر اس تماشہ گاہ کا محض ایک تماش بین ہے۔ یہ فنی خوبی اور اسے سلیقہ سے برتنے کا فن حمید نے غالباً مارکیز سے مستعار لیا ہے جو اپنے تخلیق کردہ کرداروں سے خود کو اس طرح سے علاحدہ کر لیتا ہے۔ جیسے اُس نے انہیں خلق نہیں کیا ہے بلکہ وہ اپنے وجود کی تمام تر توانائیوں اور کمزوریوں کے ساتھ خود تخلیق کا محور بنے ہیں۔ اسے آپ خود خلقی کا نام بھی دے سکتے ہیں۔ حمید کے افسانوں کی ساختیاتی صورت گری انھیں انفراد و امتیاز سے ممیّز کرتی ہے اور اُن کی عدم پہچان ہی اُن کی شناخت بن جاتی ہے۔

کہیں کہیں سے حمید کے افسانوں پر Abstract Paintings کا گمان ہوتا ہے۔ جن کی معنویت کا جواز ہے بے معنویت کے استعارے سے عیاں ہوتا ہے۔ حمید سہروردی نے لفظوں سے ایسے جادوئی طلسم کی تخلیق کی ہے جس کی شناخت اُن کا باطن ہے ظاہر نہیں حالانکہ وہ پلاٹ سے زیادہ ماحول سازی میں یقین رکھتے ہیں اور لفظوں پر کردار نگاری کا گمان ہوتا ہے۔ ان کے ایک افسانہ ''برزخ'' کا اقتباس دیکھئے:

''راشد کی آنتیں زنگ آلود ہو چکی ہیں دواخانے کے اسپیشل وارڈ میں پلنگ پر دراز ہے اور کئی ذہنی الجھنوں میں گرفتار ہے۔ وقفہ وقفہ سے چیختا ہے۔ طرح طرح کی باتیں سوچتا ہے۔ جنھیں بہت دیر سنبھال نہیں سکتا۔ آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگتا ہے۔ یہ زمین، آسمان، چاند، سورج، ستارے، پہاڑ، سمندر، ندی، جانور، چرند پرند، مشین، بلڈنگیں اور لوگ بس جی رہے ہیں۔ انھیں زندگی لفظ ورثہ میں دیا گیا ہے۔ ان کا کام بس جیتے رہنا ہے۔ چھٹکارا ناممکن، وہ سوچتے سوچتے تھک رہا ہے۔ ہاتھ پیر اکڑتے جا رہے ہیں۔ ایک چیخ مارتا ہے۔'اے پاک پروردگار'.....اور بے ہوش ہو جا تا ہے۔''

انسانی بے بسی لاچاری اور غیر یقینی صورت حال کی نقش گری کا ایسا ایجاز و اعجاز افسانہ نگار کو نقش گر بنا دیتا ہے۔ جو احساس اور خیال کی چھنی سے یگانہ لفظ ترشتا ہے جو مجسم ہو کر ہم سے مکالمہ کرتے نظر آتے ہیں۔ لفظوں کی پیکر تراشی کا عمل اور اُسے برتنے کا یکتا فن سہروردی کی فنکاری پر دال ہے۔ یہاں لفظ کردار بن جاتے ہیں اور انسانی المیہ کے مرقعوں کی صورت میں نمایاں ہوتے ہیں کہ دنیا میں نجات و برأت محض ایک تصوراتی پیکر تک محدود ہے۔ حقیقت میں آشوب کی دنیا آباد رہتی ہے۔

حمید سہروردی نے روحانی کشف و کرامات کی ایسی دنیا آباد کی ہے جو تخیل کی برنائی کے باوجود ہمارے قلبِ حزیں کو گرماد یتی ہے۔ اُن کی ایک نظم سے اقتباس تائید و توثیق میں پیش خدمت ہے:

وہ.....دائرہ
ہم.....دائرہ
آدمی صبح تک
آدمی شام تک
آدمی رات تک
آدمی
آدمی
چاروں طرف آدمی
آدمی / میں
آدمی / ہم
سورج، چاند، ستارے اور سیارے
غار، پہاڑ، زمین اور پاتال
آدمی ہر طرف
آسماں آسماں
آسماں آسماں

آسماں آسماں
آسماں میں خدا
غار، پاتال اور کھنڈرات میں بھی خدا
ہر جگہ
ہر طرف ہے خدا
نیند آنکھوں میں جمنے لگی
کاش
اب تو ملے
مجھ کو میرا خدا

(نظم: ایک بے کیف لمحہ کی خالص نظم، کے اقتباسات)

خالق کائنات ہمارے تزکیہ نفس اور تطہیر نفس کے لیے از بس ضروری اور لازمی ہے کہ ہمیں زماں و مکاں میں ہر ذرہ کائنات میں اس کی تلاش رہتی ہے۔ حمید سہروردی نے تنہائی اور اس کے کرب کو بھی مار گیز کی طرح اپنی روح میں شدت کے ساتھ اُتارا ہے۔ جس سے تنہائی کے سو سال کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ تمام تر آسودگیوں کے باوجود تنہائی انسان کا مقدر قرار دی گئی ہے۔ عمر کی ایک منزل پر وہ خود کو اکیلا محسوس کرتا ہے اور اعتکاف کی دنیا میں چلا جاتا ہے کہ یہ روحانی سرشاری اُسے ثبات و قرار سے ثبات و قرار کا احساس کراتی ہے۔ ورنہ کھوئے ہوئے راستوں کی تلاش اُسے بے قرار اور مضطرب رکھتی ہے۔ ہم سبھی ذی حس منزل مقصود کی تلاش میں ایسے کارواں کے ساتھ سفر کر رہے ہیں جس کی کوئی منزل نہیں۔ یہ تاریکی کا طویل سفر ہے جس کا کوئی اختتام نہیں۔

انسانی رشتوں کی شکست و ریخت حمید سہروردی کے افسانوں کا حاوی موضوع رہا ہے۔ قربتیں دوری میں اور دوری قربتوں میں بدلتی رہتی ہے کہ کوئی بھی کیفیت مستقل اور پائیدار اساس نہیں رکھتی۔ زماں و مکاں کے عنکبوت میں پھنسا ہوا انسان اپنے زوال کا منظر آنکھوں میں اوتارتا رہتا ہے کہ اس کے بغیر کوئی چارہ کار نہیں۔

جنریشن گیپ بھی حمید سہروردی کا موضوع سخن رہا ہے۔ وقت ہماری آنکھوں کی پلکوں پر ٹھہرا رہتا ہے اور نئے لوگ ہم میں خود کو تلاش کرنے کے بجائے ایک جہان تازہ کی تخلیق کے تار و پود بنتے رہتے ہیں۔ صدیوں کا سناٹا نئی نسل کو تاریک راہوں کے کارواں کا مسافر بنا دیتا ہے۔ خود آگہی کی تلاش میں وہ زماں و مکاں کی نئی تشریحات و توضیحات کے عمل مسلسل کا ناگزیر حصہ بنے رہتے ہیں۔

دشت ہو کی صدائیں عجائبات و نوادرات کی دنیا میں صیقل ہو جاتی ہیں۔ ماضی کھنڈر کی صورت میں عفریتی قوتوں کے ساتھ نبرد آزما رہتا ہے۔ ماقبل تاریخ کی کہانی ایک تسلسل کے ساتھ ہمیں ڈراتی اور چونکاتی رہتی ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''میں جس جگہ بیٹھا ہوا ہوں ..... وہاں عفریتوں کا استھان ہے۔ اس بات کا انکشاف ماقبل تاریخ سے ملایا جاتا ہے۔ ماقبل کی تاریخ کی ایک کہانی ابھی تک چلی آ رہی ہے جس کے کئی رنگ بے رنگ ہو کر بھی اپنی اصلیت میں کوئی فرق نہیں رکھتے۔''

زمین کے ساتھ انسانی رشتوں کی کہانی بھی ایک پر اسرار راز کی طرح بڑھنے اور پھیلنے لگتی ہے۔ انسان لاسمتی کے گہرے سمندر کے بھنور میں گھرا ہوا ہے۔ وہ سمندر کو اپنے اندر جذب کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ حالانکہ وہ اس حقیقت سے آشنا ہے کہ اس کا وجود ایک قطرہ تک محدود ہے۔ کیا یہی ایک قطرہ سمندر کے وجود کو لے ڈوبے گا، سوالوں کا ایک طوفان ہے جس میں انسانی کشتی ہچکولے کھا رہی ہے۔ ایک اقتباس تائید و توثیق بھی ملاحظہ فرمائیے:

میں نہیں ہوں/میں ہوں

میں آوارہ بادل بھی نہیں ہوں
مجھ میں اُتر کر دیکھو
غول بیابانی کا منظر
سینکڑوں برسوں سے میرے قدم چلنے کی خواہش میں
پاگل ہوتے جا رہے ہیں۔
میں اُفتاں وخزاں، ظلمت سے ہوتا ہوا، تیری خلوت
گہہ کے مناظر کو پالوں گا عجب نہ جانو مجھے۔
میں کہ سینکڑوں برسوں کا کرب ہوں
لاوے کی طرح ابل پڑوں گا
مانا کہ تیری قلمرو میں میری دست رس نہیں
میں تمہاری قلمرو کا نگہبان نہیں ہوں
میری آنکھیں سمندر کے اس طرف دیکھ رہی ہیں ر
جہاں خواب ہنستے ہیں ر لیکن میں خواب نہیں ہوں ر میں دھرتی کا
ایک راز ہوں
آوازیں بڑھتی ہی جا رہی ہیں.....
یہ آواز مقتل سے آ رہی ہے۔''

انسانی وحشت اور بربریت کا خونی دائرہ بڑھتا پھیلتا جا رہا ہے۔ شہر آگ کی آواز سے تلملانے لگا..... دھرتی کو نیست و نابود کرنے والی انفعالی طاقتیں برسرپیکار ہیں اور نیست و نابود کرنے والی قوتوں سے انسان اور انسانیت نبرد آزما ہیں کہ اسی میں نجات و برأت کا پہلو مضمر ہے۔

حمید سہروردی کی ایک کہانی ''نہیں، نہیں، ہاں ہاں'' پڑھنے کے بعد میرے ذہن کے گوشوں میں زبیر رضوی کی نظم ''علی بن متقی رویا'' کے بعض حصے جاگ اُٹھے:

''سنا کرتے ہیں کہ پرانے زمانے کے لوگ حرافوں
کو گھر بلا کر اپنی مردانگی کا جشن مناتے تھے۔ یعنی
عورت بازاری عورت سر پر سوار تھی۔ عورت کے
وجود سے انکار ممکن نہیں، لیکن تہذیب کی ناک کو
اونچا کرنا اور جشن مردانگی..... کہاں کی عقل مندی
تھی۔''

حمید سہروردی نے صنف نازک کے بارے میں اپنے منزہ جذبات کا اظہار اس طور پر کیا ہے:

''میں مٹی میں پاک خوشبو اور آگ میں روشنی ہوں۔
میں سب جانداروں کی روح میں روں دواں ہوں
.....لیکن میری حسرتیں عود، لوبان، اگربتی، خوشبو اور
مسالوں اور آبِ زم زم میں تحلیل ہوگئی ہیں اور آبِ
زم زم کے چھینٹوں سے پورے جسم کے سیاہ سرخ
دھبے دُھل چکے ہیں۔''

حمید سہروردی تجریدی ٹکنیک کو اپنے افسانوں میں بہ طریق احسن برتتے ہیں۔ حمید سہروردی کے افسانے ''نہیں نہیں، ہاں ہاں'' سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں کہ یہی ہمارے مضمون کا اختتامیہ ہے:

''میرا پورا جسم پسینہ سے شرابور ہو چکا ہے، ہر
طرف مائع ہی مائع نظر آ رہا ہے۔ خوابیدہ
آنکھوں کی تمام تر حرمتیں ایک گہری گھاٹی میں
کود پڑتی ہیں اور ٹھوس زبان سیال بن چکی ہے
اور اِدھر اُدھر منتشر ہونے لگی ہے۔ قوی اور
مضبوط ہاتھ حرکت کے سر پر مسلط ہیں اور عقل
ماتم کدہ سے آگے نکل چکی ہے۔ تمام طے شدہ
پروگرام بکھر گئے ہیں۔ زمین تڑخ تڑخ گئی
ہے اور آسمان کا سینہ شق ہو گیا ہے۔ خلا کی بے
حسی، بے بسی کا روپ دھار چکی ہے۔ اُٹھتے
پیروں کے منصوبے تحلیل ہو گئے ہیں اور
میرے اندر اور باہر کے ماحول میں پرشور سناٹا
بہہ رہا ہے۔''

☆☆☆

طیبہ نازلی

مضمون

جاپان میں اردو کے حوالے سے، ہندو جاپان کے تہذیبی روابط

جاپان میں اردو کے حوالے سے، ہندو جاپان کے تہذیبی روابط- جاپان کے اردو اسکالرز کا رول - ''جاپان چلو - جاپان چلو'' Indo - Japan Cultural Relations with A Reference to Urdu in Japan - "The Role of Japanese Urdu Scholars" - "Japan Chalo - Japan Chalo"

ہندو جاپان کی ثقافتی تعلقات نا معلوم عرصہ سے چلے آ رہے ہیں۔ تاریخی ریکارڈ کے مطابق بدھ مت ساتویں صدی ہندوستان سے جاپان پہنچا جو چین اور کوریا کے راستے وہاں پھیلا۔ بدھ مت کے تعارف کے ساتھ ہی جاپان و ہند کے تعلقات چھٹویں (6th Century) صدی سے ہی شروع ہو چکے تھے۔ ہندوستانی راہب بودھی سینا 736 عیسوی میں ہی بدھ مت کے پرچار کیلئے جاپان پہنچ چکے تھے اُنکے انتقال تک یعنی 760 عیسوی تک وہیں رہے۔ جاپانی ثقافت پر بدھ مت کے گہرے اثرات مرتسم ہوئے جسکی بدولت ہندوستان و جاپان کے درمیان صحت مند تعلقات وجود میں آئے۔

بدھ راہبوں، کے وہاں پہنچنے کی وجہ سے سکالروں اور طلباء بھی جاپان کو آٹھویں صدی سے ہی جانے لگے اور نالندہ یونیورسٹی لائبریری ریکارڈ کے مطابق جاپانی سکالر اردو طلباء بھی کو حصولِ تعلیم کی غرض سے ہندوستان آتے رہے ہیں۔

Tenjiku Tokubei بہت ہی مشہور سیاح گذرے ہیں جنہوں نے (1612-1642) کے درمیان ہندوستان کا سفر کیا تھا۔ اُنکا نام تینجیکو ہندوستان کے نام پر پکارا جاتا تھا کیونکہ ہندوستان کو جاپانی Tenjiku کے نام سے یاد کرتے ہیں جسکے معنی ہیں ''جنت کا مقام''۔ یہ تاریخی تعلقات اُس وقت اور مستحکم ہوئے جب جاپان نے (16th Century) سولہویں صدی میں ہندوستان میں پرتگالی کالونی سے اپنے سیاسی تعلقات کو قائم کیا لیکن راست سیاسی منظر (Meigi) میجی کے دور حکومت (1868-1912) میں اُبھرا جب جاپانی جدیدکاری (Modernization) کی پالیسی پر عمل پیرا ہوئے۔ اسکے بعد آپسی تعلقات بیسویں صدی میں اور مضبوط ہوئے جب جاپانی فلموں کا ہندوستانی سماج پر اور ہندوستانی فلموں کا جاپانی سماج پر گہرا اثر پایا گیا۔ ستیہ جیت رائے، گرودت اور رجنی کانت کی بنائی ہوئی فلموں کو جاپان میں زبردست مقبولیت ملی اور اِسی طرح اکیرا کروساو Akira Kurusav اور دوسروں کی بنائی ہوئی فلموں نے 1950 اور 1960 کے دہائیوں میں ہندوستانی فلموں پر اپنا گہرا اثر مرتب کیا۔

ہندوستان- جاپان کے مابعد جنگ معاشی ترقی کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے جس نے جاپان کی تعمیرِ نو کو بدعجلتِ ممکنہ انجام دیا۔ بیسویں صدی کے اوائیل میں ہی ہندوستان نے جاپان کو اُبھرتی طاقت کے طور تسلیم کیا اور خوش آمدید کہا۔ 1905 میں ہوئی جاپان۔ روسی جنگ میں جاپان کی کامیابی نے ہندوستان کو بہت متاثر کیا جو اُس وقت اپنی آزادی کے لئے کوشاں تھا۔ اُس وقت جاپان جہدکاروں کو پناہ دینے کے لئے آگے آیا جس سے دوستی اور مضبوط ہوئی۔ کئی ہندوستانی رہنماؤں اور انقلابیوں کی جاپان کے با اثر قوم پرستوں نے بھی مدد کی اس طرح رشتے اور استوار ہوئے۔ (کئی ہندوستانی رہنماؤں اور انقلابیوں کی جاپان کے با اثر قوم پرستوں نے بھی مدد کی، اس طرح رشتے اور استوار

ہوئے۔

جاپان اپنی لگاتار و تیز تر کامیابی، سخت محنت اور اپنی آزادی کی حفاظت کی صلاحیت کیوجہ سے ایک مثال بن گیا۔ چنانچہ (1902-1863) کے دوران یعنی 1892 میں جب سوامی وِویکانندا نے جو مذاہب کی عالمی کانگریس (1863) کے لئے شکاگو روانہ ہو رہے تھے، انہوں نے جاپان کی مثال دی اور کہا کہ ہندوستان کو جاپان کی مثالی ترقی سے بہت کچھ سیکھنا چاہئے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جاپانی مفکر (Okakaru Tenshin) اوکاروتین ثین اور قلم کار، شاعر، مفکر، فلسفی رابندر ناتھ ٹیگور میں دوستی تھی، تین شین اور پریمودا بنرجی میں بھی دوستی قائم تھی۔

ادکا کارو کا کوزو (Okakaru Kakuzu) اور رابندرا ناتھ ٹیگور نے ہندوستانی اور جاپانی سکالروں اور طلباء کے باہمی تبادلہ میں نہایت اہم رول ادا کیا۔ Baron Okakaru 1902 میں ہندوستان تشریف لائے، اُنکا ایقان تھا کہ بنیادی طور پر تمام ایشائی کلچرز اور انکے اُصول تقریباً مماثل ہیں، Baron کا یہ خیال تمام سیاسی اور ثقافتی گروؤں کے دل میں گھر کر گیا اور سبھی کو اس بات سے فیضان ملا۔

آرٹسٹ اوکا کارو جو کہ سجی سکول آف آرٹ سے وابستہ تھے کا انکا نامور جاپانی آرٹسٹوں کو ہندوستان بھیجنے میں بہت اہم رول رہا ہے جو کہ ٹیگور کی فیملی کے ساتھ دو سال تک بنگال میں مقیم رہے جنہوں نے ٹیگور کی سرپرستی میں جدید بنگالی تحریک (Modern art movement in Bengal) پر گہرا اثر قائم کیا۔ ماہرینِ Juit jit su بھی ہندوستان بھیجے گئے جنہوں نے شانتی نکیتن کے طلباء کو مارشل آرٹس میں تربیت دی۔ تبادلۂ طلباء پروگرام کے تحت ہندوستانی طلباء نے بھی جاپان جا کر ceramic اور پارچہ بافی textile وغیرہ کی تربیت لی۔ گاندھی جی سے جاپانی بہت متاثر۔ 1930 میں سکالرر Mr. Yore Nogudi، مشہور شاعر کے ہمراہ ہندوستان آئے، انہوں نے کلکتہ یونیورسٹی میں لکچرز دیئے۔ ایک مشہور جاپانی پینٹر نے لارڈ بدھا کی زندگی پر ایک تسلسل قائم کرتے ہوئے پینٹنگس بنائیں۔

سنسکرت جو کہ ایک کلاسیکی (قدیم) زبان ہے، بدھ مت اور ہندومت کے لئے اہمیت رکھتی ہے۔ جاپان کے مذہبی رہنما اُسے اب بھی استعمال کرتے ہیں۔ سیدھا Siddha زبان بھی وہاں لکھی جاتی ہے۔ 1899 میں ٹوکیو امپیریل یونیورسٹی نے سنسکرت اور پالی زبان کی چیرز (Chairs) قائم کی ہیں اسکے علاوہ (1903) تقابلی یا بین مذہبی تعلیم کے لئے بھی Chair قائم کی گئی۔

جاپان انڈیا ایسوسیشن (1903) میں ہی قائم ہوگئی تھی، 1956 میں ہند جاپان مِلکسڈ کمیشن دونوں قوموں کے ثقافتی تعلقات کے فروغ کے مقصد سے قائم کیا گیا۔ جو باہمی ثقافتی کمیشن کہلاتا ہے۔ کمیشن کا قیام تعلقات کو استحکام دینے اور دونوں ممالک میں ثقافتی میلوں کا انعقاد عمل میں لانے، بشمول مختلف ڈانس ڈ کی نمائش، غیر معمولی صلاحیتیں رکھنے والی شخصیات کا دونوں جانب سے دورہ، سکالروں، کامیاب شخصیتوں اور آرٹسٹوں کا تبادلہ و مشاہدہ کو عمل میں لانے کی غرض سے کیا گیا۔ جاپانی سکالروں کے جانب سے ہندوستانی قدیم وجدید اور دورِ حاضر کی تفصیلات جاننے میں دلچسپی دکھائی گئی۔ دونوں ہی ممالک نے ایک دوسرے کی زبان سیکھنے کے مراکز کھولے۔ ہندوستانی جامعہ جیسے JNTU – دہلی اور ووشوا بھارتی یونیورسٹیوں نے جاپانی زبان سیکھنے کے مراکز کھولے۔ اُمیّد کی جاتی ہے کہ سائنس وٹکنالوجی کے میدان میں بھی ایک دوسرے کا تعاون حاصل ہوگا۔ ٹائمز آف انڈیا کی رپورٹ کے مطابق پچھلے تین سالوں میں ہندوستانی طلباء میں جاپانی زبان سیکھنے کا شوق بڑھا ہے۔ پونا میں Japanese

Language Proficiency Test (JLPT) لکھنے والوں کی قابلِ لحاظ تعداد ریکارڈ کی گئی اور ٹسٹ لکھنے والوں میں 40% طلبا کا اضافہ نوٹ کیا گیا جو کہ ہندوستان کے دوسرے شہروں کے بہ نسبت بہت زیادہ ہے۔ ڈسمبر 2011 تک JLPT لکھنے والے طلباء کی تعداد 1000 تک پہنچ چکی تھی۔ DNA نیوز (Dec 2017) کے مطابق پونا میں جاپانی سیکھنے والے طلباء کی تعداد 3000 ہوگئی ہے۔ جاپانی سفیر اَکیٹا کاسائیکی (Aketaka Saiki) کے مطابق ''مجوزہ دہلی-ممبئی صنعتی راہدری کیوجہ سے جاپانی گورنمنٹ نے ہندوستان میں بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کی ہے جس کی وجہ سے جاپانی زبان بولنے والوں کی ضرورت میں اضافہ ہوا ہے۔ جاپانی زبان کے کوآڈینیٹر جناب پروجاول چھنا گائیر، Projawal Chaunagire، شعبۂ غیر ملکی زبان، یونیورسٹی آف پونے نے کہا ''جاپانی زبان کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ شہر پونا میں نہ صرف اس زبان کو سکھانے کے کئی مراکز ہیں بلکہ 70 تا 80 اَساتذہ بھی موجود ہیں۔ ہندو جاپان اُبھرتے تعلقات کے بنا کئی نوجوان گریجویٹس، آئی ٹی پیشہ ور، اور دوسرے کیریئر کو بنانے کے لئے جاپانی زبان سیکھ رہے ہیں۔ ہندوستانی گورنمنٹ نے بھی خاص اسکیمیں بنائی ہیں جاپانی زبان کے فروغ کے لئے۔

TUFS:- ٹوکیو یونیورسٹی آف فارن اسٹڈیس نے بہت زیادہ اور متنوع موضوعات پر ہندوستانی تہذیب اور اسلامی کلچر پر تحقیق کی جو کہ ہندوستانی تہذیب اور مغربی ایشیاء کے ملاپ سے وجود میں آئی۔ اردو اور ہندی دنیا کی تیسری سب سے زیادہ بولی جانے والی زبانیں کہلاتی ہیں اگرچہ کہ جاپان میں روایتی طور پر بدھسٹ فلسفہ پر اور سنسکرت کی بنیاد پر زور دیا گیا لیکن ماڈرن تعلیم میں ہندوستانی زبانوں کو بھی اہمیت دی گئی۔ ٹوکیو اسکول آف اسٹڈیس کے 1908 میں قیام کے ساتھ ہی وہاں اردو پڑھانا شروع کیا گیا۔ شروعاتی دور میں اس شعبہ کو ڈپارٹمنٹ آف ہندوستانی لینگویج کہا جاتا تھا جو کہ اُس زمانے میں اُردو کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ 1949 میں اسکول کو اَپگریڈ کیا گیا اور یونیورسٹی کا درجہ دیا گیا اور دو علیحدہ ڈپارٹمنٹس اردو اور ہندی کے قائم کئے گئے۔ پروفیسر کٹاوکا کے مطابق جاپان میں اُردو 1663 میں ہی متعارف ہوچکی تھی جبکہ ایک جہاز ویٹنام سے ناگاساکی آیا تھا۔ اُس جہاز کا کپتان ایک 'موز' (Moor) یعنی مسلمان تھا۔ پروفیسر ناگاشیما نے پانچ قسم کی تحریروں کا مجموعہ 'polyglot' دریافت کیا تھا جس کو (1971) میں ناگاساکی زبان میں منتقل کیا گیا اس polyglot میں Moorish زبان کا حوالہ ملتا ہے۔ دراصل موریش زبان فارسی زبان ہے اور فارسی زبان کے الفاظ اُردو میں پائے جاتے ہیں۔ یہی polyglot جاپان میں اُردو زبان کا قدیم حوالہ بنتا ہے۔

وہ دو دانشور جو جاپان میں اُردو کے فروغ اور شہرت دلانے کے ذمہ دار ہیں، وہ ہیں پروفیسر گیمن رئیکی Gamon Reiki اور پروفیسر سوزوکی تاکیشی Suzuki Takeshi جنہیں بجا طور پر جاپان کی بابائے اُردو کہا جاسکتا ہے۔ جاپان کی تین بڑی یونیورسٹیوں میں اُردو پڑھائی جاتی ہے۔ (۱) ٹوکیو یونیورسٹی (۲) اوساکا یونیورسٹی اور ڈائیٹو بنکا یونیورسٹی۔ 2008 میں TUFS نے اُردو تعلیم کے 100 سال پورے کر لئے ہیں۔ اِن جامعات سے جڑے ہوئے اسکالرز نے اُردو زبان و ادب میں گرانقدر تحقیقی کام انجام دیا ہے تو کچھ نے تو اُردو کے شاہکار ادب کو جاپانی میں منتقل کرنے کا ذمہ لیا۔ اُنکی بے بہا خدمات نے جدید اُردو ادب کو جاپانی میں ترجمہ کر کے اُردو ادب کو شہرت بخشی۔

جاپانی اُردو اسکالروں کی بیش بہا خدمات:-

☆ **پروفیسر رئیکی:-** جنہوں نے ٹوکیو یونیورسٹی سے 1923

میں گریجویشن کیا تھا، اُسی یونیورسٹی میں بحیثیت لکچرار 1925 میں مامور ہوئے۔ وہ پہلے جاپانی اُردو اسکالر ہیں جنہوں نے وہاں اُردو پڑھانا شروع کیا۔ وہ 1934 میں پروفیسر بنے۔ وہاں بغیر کسی مواد کے اُردو کی تدریس بہت مشکل تھی چنانچہ اس مسئلہ پر قابو پانے کے لئے پروفیسر رئیکی نے بنیادی اردو کی کتابیں لکھیں۔ 1938 میں اُنہوں نے اُردو کی ''ابتدائی قوائد'' لکھی اور آنے والی کئی نسلوں کو اُردو سیکھنے میں مدد کی۔ اُنکا دوسرا بڑا کام/ تعاون 'باغ و بہار' کا جاپانی میں ترجمہ ہے۔ اُنکی دوسری کتابیں ''ایرانی تاریخ و تہذیب''، ''اسلام'' اور 'بول چال کی اردو' ہیں۔ انکی جمع کردہ کتابوں کا سرمایہ TUFS میں محفوظ ہے۔

☆ **پروفیسر تاکیشی**:- پروفیسر سوزوکی تاکیشی پروفیسر رئیکی کے ہی شاگرد ہیں، جنہوں نے 1963 میں TUFS جوائن کیا تھا۔ اِنہوں نے جدید اُردو فکشن جاپانی زبان میں ترجمہ کیا، کئی مضامین اُردو کی تاریخ اور اُسکے ارتقاء کے بارے میں لکھے، اردو تنقید اور تذکرے بھی لکھئے۔ مزید یہ کہ 1947 کے فسادات پر جو اُردو لٹریچر ہے اُس پر تحقیقی مقالے لکھے اور اُردو کے لیجنڈری پبلشر نول کشور کے بارے میں بھی بہت کچھ لکھا۔ اُنکے دیگر کام اُردو قواعد، اردو بول چال، اُردو- جاپانی ڈکشنری، ابتدائی اُردو کی آسان کہانیاں ہیں۔ پروفیسر تاکیشی کا عظیم کارنامہ بیس ہزار الفاظ پر مبنی اُردو۔ جاپانی ڈکشنری ہے جو اُنکی محنت شاقہ کی مثال ہے۔ اُنہوں نے 2005 میں آخری سانس لی۔ بعد میں پروفیسر ہیروشی یا گیتا جو کہ پروفیسر سوزوکی کے رفیق کار رہے، نے ڈکشنری کو آخری شکل دے کر پبلش کرنے کے لئے بھیجا۔

☆ **پروفیسر ہیروجی کٹاؤکا** :- 1941 میں ٹوکیو میں پیدا ہوئے جو پروفیسر سوزوکی کے ہی شاگرد ہیں، ٹوکیو یونیورسٹی سے اُردو میں ماسٹرس (P.G) کرنے کے بعد اُنہوں نے اوساکا یونیورسٹی کو (1974) جوائن کیا اور وہاں اُردو زبان و ادب کی تعلیم دینے لگے۔ وہ شعبہ 'برائے بین الاقوامی تعلقات' کے ڈین اور 'اِدارہ برائے عصری ایشائی مطالعات' کے ڈائیریکٹر کے عہدوں پر ڈائٹو بنکا یونیورسٹی میں کارگذار رہے۔ وہ غالبؔ پر انکے کام کے لئے شہرت رکھتے ہیں۔ اسکے علاوہ اُردو زبان و ادب اور پاکستانی تہذیب و ثقافت پر انہوں نے 60 سے زیادہ مقالے لکھے۔ فیض احمد فیضؔ اور منٹو کے کام کا ترجمہ کرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے فیضؔ، میراجی، ن۔م راشد، اکبرالہ آبادی اور دوسرے اُردو شاعروں پر بھی مقالے لکھے۔ پروفیسر کٹاؤکا کا ایک اور قابل قدر کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے جاپان میں اردو مشاعروں کی بنیاد ڈالی جو کہ پچھلے دس سے زائد برسوں سے کامیابی کے ساتھ منعقد کئے جا رہے ہیں۔ اِن مشاعروں میں ٹوکیو اور اوساکا سے سامعین کی بڑی تعداد شریک ہوتی ہیں۔

☆ **پروفیسر اَسادہ یوٹوکا** :- TUFS میں شعبۂ اُردو کے چیرمین ہیں۔ 1981 میں وہ اس شعبہ سے وابستہ ہوئے۔ ان کی کئی کتابیں شائع ہوئی ہیں جن میں ''منتخبِ اُردو ادب''، ''سادات کا ادب''، ''خواتین کا ادب'' کے علاوہ اُردو سیکھنے کے لئے لکھی گئی کتابیں بھی شامل ہیں۔

☆ **پروفیسر ہیروشی** :- یہ بھی پروفیسر تاکیشی کی ڈکشنری سے جُڑے ہوئے ہیں۔ اِنہوں نے اردو فکشن کے مصنفین احمد علی، سیادت اللہ انصاری اور اُردو کے سکھ رائیٹرز کے بارے میں لکھا ہے۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ شوکت صدیقی کی تصنیف 'خدا کی بستی' کا جاپانی میں ترجمہ ہے۔

☆ **ماتسومارا** :- اردو کے بڑے اسکالر اور اوساکا یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر (HOD) ہیں یہ بھی اپنے عشقِ اُردو کے لئے مشہور ہیں۔ جدید اردو لٹریچر کے علاوہ انہوں نے سرسید، حالی اور اقبال پر مقالے تحریر کئے ہیں۔ اسکے علاوہ ولی دکنیؔ، میر تقی میرؔ، خواجہ میر دادؔ اور ناسخؔ کی منتخب غزلیات کا جاپانی زبان میں ترجمہ کا

اِضافہ کیا ہے۔ دوسری کتابوں میں اُردو قواعد پر ایک مفصل اور جامع کتاب، آبِ حیات (محمد حسین آزاد)، دبستانِ دہلی اور لکھنؤ پر لکھے گئے مقالے ہیں۔

اوساکا یونیورسٹی کے دوسرے قابلِ احترام آزمودہ کار جنہوں نے اردو کی ترویج کے لئے کام کیا ہے، وہ ہیں پروفیسر 'ساوا' اور پروفیسر ہیروشی کنکا گایا، عصر حاضر کے دو اہم ناموں میں پروفیسر کنسا کی مارمیان اور پروفیسر دیامانے ہیں جو اوساکا یونیورسٹی میں اردو پڑھاتے ہیں۔ پروفیسر یامانے نے 2003 میں ایک کتاب کی تالیف کی ہے جس میں پاکستان کی تاریخ، تہذیب، زبان، اردو ادب اور اسلام کے موضوع پر 60 مقالے شامل کئے گئے ہیں۔ اور وہ مزید تحقیق میں مصروف ہیں۔ نہایت شستہ اُردو اور پنجابی بولتے ہیں اور غلام عباس کے کام کا جاپانی میں ترجمہ بھی کر رکھا ہے۔ حال ہی میں اردو اِملا اور اِسکی تاریخ پر مقالہ شائع کیا ہے اور اِنکا تازہ ترین کام 'انٹرنیٹ کے ذریعہ اُردو کی تدریس' ہے۔

جاپان میں 'اردو کی مختصر تاریخ' اردو اساتذہ و اردو تعلیم و فروغ کے ذکر کے بعد جاپان سے متعلق ایک نہایت دلچسپ سفرنامے کا ذکر یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے جو بین الاقوامی سطح پر مشہور اور مقبول ہے۔ اس سفرنامے سے جاپان کی روزمرہ کی زندگی اور دوسری کئی باتوں کا علم ہوتا ہے۔

جاپان چلو جاپان چلو

پدم شری مجتبیٰ حسین صاحب ایک بین الاقوامی شہرت یافتہ اور نہایت مقبول ادیب 'کالم نگار' طنز و مزاح کے لئے شہرت کے حامل مصنف ہیں۔ طنز و مزاح پر مبنی انکی تقریباً 25 کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان پر کئی اسکالروں نے پی ایچ ڈی کیا ہے اور کر رہے ہیں۔ ان کا طرۂ امتیاز انسان دوستی رہا ہے۔ مجتبیٰ حسین نے اپنی تحریروں میں زیادہ تر عام آدمی اور اُسکی سرگردان زندگی کو پیش کیا ہے۔ ایک شائستہ و پرسکون زندگی کا بھرم رکھنے کی ایک عام تہری کی جدوجہد کا بڑی باریکی بینی سے نہ صرف مطالعہ کیا ہے بلکہ اُسکے ہر پہلو پر قلم اُٹھایا ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ وہ سماج کی ناہمواریوں کے بارے میں تحریر کرنے سے پہلے اسکو محسوس کرتے ہیں، انکی تحریروں کا سب متاثر کن پہلو یہ ہے کہ اپنی شخصیت کو ہمیشہ پس منظر میں رکھا، اسکو نمایاں کرنے سے ہمیشہ گریز کیا۔ انکساری سے کام لیتے ہیں بلکہ اکثر اپنے آپ کو نہایت معمولی، غیر اہم شخص کے طور پر پیش کیا۔ یہی انداز ان کی عظمت اور اعلیٰ ظرفی کی دلیل ہے، وہ خود پر ہنستے ہیں اور دوسروں کی خوبیوں کو سراہتے ہیں، کشادہ ذہن و دل رکھتے ہیں۔ ان کی تحریروں کی مقبولیت کا راز یہی ہے کہ وہ روزمرہ کے مسائل کا منظر نامہ اس ڈھنگ سے کھینچتے ہیں کہ یہ احساس ہوتا ہے کہ ''میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔ پچھلے 50 سال کے دوران ان کی 25 کتابیں شائع ہو چکی ہیں، بے شمار کالم اور اِنشائیے لکھتے ہیں۔ بہر حال اُنکی شخصیت اور مزاح نگاری کا جائزہ نہ تو مرے لئے ممکن ہے اور نہ ہی یہاں مقصود ہے۔ مشہور و معروف انگریزی مصنف، کالم نگار، طنز و مزاح نگار جناب خشونت سنگھ نے مجتبیٰ صاحب کے بارے میں کہا ہے کہ

Rare among Indian writers of humour," while he is unable to say anything unkind about others, he is equally unable to say in his own praise" whenever the subject of humour in Urdu writings comes up, the first name that is mentioned is of Mujtaba Hussain of Hyderabad." (Khushwant Singh)

یوں تو انکے کالمس دنیا بھر میں مقبول ہیں لیکن جاپان چلو، جاپان چلو ایک ایسا منفرد سفرنامہ ہے جو اردو ادب میں نایاب ہے۔ یہ مزاح

سے بھرپور سفرنامہ لاجواب ولاثانی ہے۔ جونہایت لطیف پیرائے میں جاپان کی سیر بھی کرواتا ہے۔مجتبیٰ حسین کی تحریریں اور کتابیں اُڑیا، کنڑا، ہندی، انگریزی، روسی اور جاپانی زمانوں میں ترجمہ کی گئی ہیں۔

اِس مقالے میں کوشش کی گئی ہے کہ اِس سفرنامے میں مصنف کے احساسات کو اُجاگر کیا جائے۔ دورانِ مطالعہ قاری نہ صرف اُس سفر میں شامل ہو جاتا ہے بلکہ اُنکے ساتھ ہنستا اور اُداس بھی ہو جاتا ہے۔ اس سفرنامے میں شخصی تجربات، واقعات کے علاوہ ایسے کئی جملے ملتے ہیں جو مصنف کی حسّاسیت اور اُداسی کو بھی ظاہر کرتے ہیں، انسانی رشتوں کی آفاقیت عیاں ہوتی ہے جب وہ جاپان کو چھوڑتے وقت اُداس ہو جاتے ہیں، افراد سے ہی نہیں بلکہ انہوں نے سبزہ زاروں اور کہساروں سے اُنسیت محسوس کی۔ یہ احساسات انسانی اقدار کی علامت بن کر تابندہ ہو گئے ہیں۔

سفرنامے کی شروعات بڑی لطیف پیرائے میں اور ہلکی پھیلکی مزاح کے ساتھ ہوتی ہے جہاں مصنف کو اِطلاع دی جاتی ہے کہ انہیں ٹوکیو میں یونیسکو (UNESCO) کے جانب سے منعقد ہونے والے اشاعت سے متعلق ایک ٹریننگ کورس میں شرکت کے لئے بھیجا جا سکتا ہے۔ اسکے مہینہ بھر بعد اُنکے رفیق کار نے بتایا کہ ''اگر تم جاپان سے میرے لئے ایک ٹرانسسٹر لانے کا وعدہ کرو تو تمہیں ہم خوشخبری دیتے ہیں''۔ اسکے فوراً بعد انہوں نے مصنف کو ٹرانسسٹر کی خصوصیات پر مبنی ایک لمبی فہرست تھمادی اور گویا ہوئے کہ انہیں ہندوستانی سنٹرل منسٹری کے طرف سے ٹریننگ کورس میں شرکت کے لئے منتخب کیا گیا ہے اور یہ کہ وہ جاپان جا رہے ہیں۔ اپنے دوستوں کو اطلاع دینے پر انکو تحفوں کی ایک لمبی فہرست ملی جو اُنہیں جاپان سے لانے تھے۔ دریں اثناء اُنکی شریک حیات نے اُن سے یہ وعدہ بھی لے لیا تھا کہ وہ کوئی سفرنامہ نہیں لکھینگے۔

سفر کا آغاز ہوا اور طیارے میں انکی کسی جاپانی سے پہلی ملاقات ہوئی جو مجتبیٰ حسین صاحب کی جاپانی زبان کی وقفیت سے بہت متاثر ہوا جو صرف تین جملوں پر مشتمل تھی (یہاں طنز کی کاٹ ملاحظہ کرنے لائق ہے)۔ بعد میں یہ جاپانی انکا دوست بنگیا اور انہیں ڈرائی نروٹس تحفہ کئے جب اُسے معلوم ہوا کہ مصنف نے پلین میں کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔ ایئرپورٹ پر اُترنے کے بعد ٹوکیو ایئرپورٹ پر بک ڈیولپمنٹ کی چیف مسز آسانو نے ان کا استقبال کیا، اس پورے سفر میں مسز آسانو کا بڑا اہم رول رہا کہ اُنہوں نے جب بھی مصنف کو مشکل میں پایا، اُنکی مشکلیں آسان کردیں چنانچہ مصنف نے انہیں بتایا کہ وہ اردو زبان کے مطابق اسم با مسمیٰ ہیں جو مشکلوں کو آسان کرتی ہیں، یہ سن کر مسز آسانو بہت خوش ہوئیں اور بتایا کہ وہ اُردو میں اپنے نام کے معنی سے واقف ہیں کیونکہ اُنہیں پاکستانی ادیب ابنِ انشاء نے بتا دیا تھا جنکی ٹوکیو میں اکثر آمد ہوا کرتی تھی۔

وہاں قیام کے دوران انہیں علم ہوا کہ جاپان میں 'سوزوکی' ہر جگہ پائے جاتے ہیں، چاہے وہ موٹر سائکل ہو، کار ہو یا اُس وقت کے پرائیم منسٹر ہوں جن کا نام بھی سوزوکی ہی تھا، جاپان یونیورسٹی کی ایک خاتون ترجمہ نگار بھی سوزوکی ہی تھیں۔ ''یہاں قدم قدم پر سوزوکی ہیں۔'' اتفاق سے مصنف کے پہلے جاپانی دوست کا نام بھی سوزوکی تھا جو اُس وقت ٹوکیو یونیورسٹی میں شعبۂ اُردو کے پروفیسر اور ہیڈ تھے۔ اُن سے مجتبیٰ حسین صاحب کی ملاقات (1973)، دہلی میں اس وقت ہوئی تھی جب وہ اپنی تحقیق کے سلسلے میں دہلی آئے ہوئے تھے۔ واقعہ کچھ یوں تھا کہ مجتبیٰ صاحب جب اُن سے مصافحہ کر رہے تھے اُسی وقت لائٹ چلی گئی جسکے بعد پروفیسر سوزوکی نے فوراً کہا کہ ''وہ بزم میں آئے اتنا تو میرؔ نے دیکھا، پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی''۔ دوسرے ہی دن پروفیسر سوزوکی کو حیدرآباد اور گلبرگہ جانا تھا، گلبرگہ مجتبیٰ حسین

صاحب کی جنم بھومی ہے۔ روانگی کے وقت پروفیسر سوزوکی نے انہیں اپنا وزیٹنگ کارڈ دیتے ہوئے خواہش کی تھی کہ وہ کبھی جاپان ضرور آئیں، مجتبیٰ حسین صاحب اُس خواہش کو دعاء تصور کرتے ہیں جو قبول ہوئی اور وہ جاپان پہنچے۔ بعدازیں پروفیسر سوزوکی کا ایک انٹرویو اخبار سیاست (حیدرآباد) میں بھی شائع ہوا تھا۔ اِسی سلسلے میں دکنی زبان کے معروف شاعر جناب سلیمان خطیب نے مجتبیٰ حسین صاحب کو خط میں لکھا کہ پروفیسر سوزوکی صوفیائے ہند کے بارے میں ہم ہندوستانیوں سے زیادہ معلومات رکھتے ہیں۔ وہ ہندوستان میں صوفیائے کرام کا اردو کے فروغ میں حصہ پر تحقیق کر رہے تھے۔ یہ تو تھیں جاپان جانے سے پہلی کی باتیں۔

مجتبیٰ حسین صاحب کی جاپان میں آمد کے بعد اُنکی وہاں پہلی شام تھی، مسز آسانو وہاں کی ایک چائنیز ریستوراں میں ڈنر کے لئے لے گئیں اور یہ وضاحت کی کہ ''آتے ہی میں آپ کے جوتے کھلوانا نہیں چاہتی تھی''۔ وجہ یہ کہ جاپانی ڈنر فرش پر بیٹھ کر کرتے ہیں جیسا کہ حیدرآباد میں چوکی ڈنر ہوتا ہے۔ جن لوگوں نے چوکی ڈنر کا کیا ہو وہ سمجھ لیں کہ انہوں نے جاپانی طرزِ طعام کا بھی لطف اُٹھایا ہے۔ اِسی طرح کے جملوں اور واقعات کے لئے میں بہتے بہتے آپ مصنف کے مزاح اور سنجیدگی کے امتزاج پر سر دُھنتے چلے جاتے ہیں۔ کبھی کبھار اُداسی کا لبادہ اُڑھے الفاظ آنکھوں میں آنسو لے آتے ہیں۔ احساسات کی چبھن بے چین کر دیتی ہے، درمیان میں غور وفکر پر مائل کرنے والے جملے سنجیدہ مسائل کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ موصوف کی یہ ادبی کاوش اس بات کی غماز کہ دونوں ملکوں کے عوام کو قریب لانا چاہتے ہیں۔

ہندی اور اردو کے متعلق وہ اشارہ کرتے ہیں کہ اردو اور ہندی دو بہنیں ہیں اور یہ ہیں کہ جاپان میں جو بھی اردو جانتا ہے وہ ہندی بھی جانتا ہے۔ یہاں وہ ریڈیو جاپان سے جڑے جناب اَناہارا کا حوالہ دیتے ہیں کہ ان کو دونوں زبانوں پر عبور حاصل ہے، پروفیسر تانا کا جو ہندی کے پروفیسر ہیں وہ اردو کا بھی بہترین ذوق رکھتے ہیں۔ دونوں نے کہا کہ ہندی اور اردو کا اختلاف بھلے ہی ہندوستان میں مسئلہ رہا ہو لیکن جاپان میں ہم دونوں زبانوں میں مہارت حاصل کرتے ہیں۔

آگے کے واقعات میں ذکر ہے تھائی لینڈ سے آئی ایک مندوب مس پرینیا کا، جو سونے کے لئے جانے سے پہلے مِس پرینیا نے 'سویٹ ڈریمس'' کہا تو اُنہیں یہ احساس ہوا کہ اُدھر کمرے اتنے مختصر ہیں کہ وہاں خوابوں کے آنے کے لئے تک گنجائش نہیں ہوسکتی کیونکہ جاپان میں ہر چیز بہت مختصر جسامت کی ہوتی ہے حتیٰ کہ لوگ بھی جسکی وجہ سے لوگوں کی عمر کا اندازہ کرنا مشکل ہوتا ہے، چنانچہ دوسرے سیاحوں کو مجتبیٰ حسین صاحب نے خبردار کیا ہے کہ وہ لوگوں کے قد وقامت کے بارے میں محتاط رہیں تاکہ غلط فہمی کے بناء کوئی مسئلہ کھڑا نہ ہو خصوصاً خواتین کے تعلق سے۔ ایک مرتبہ جب وہ ٹفس (TUF'S) یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں پروفیسر سوزوکی کے ساتھ بیٹھے تھے تو کتابوں سے بھرا ایک بڑا سا تھیلا لئے ایک لڑکی کمرے میں داخل ہوئی، اپنے آپ کو متعارف کرتے ہو کہا کہ میں آئیکواڈ کی ہوں اور آج شام آپ کے اعزاز میں جو محفل منعقد ہو رہی ہے میں اس میں شامل نہیں ہو سکونگی۔ جب اُن سے پوچھا کہ وہ کونسی کلاس میں پڑھتی ہیں تو وہ شرما کر بولیں کہ وہ شعبۂ فارسی کی پروفیسر ہیں۔''

ٹوکیو شہر حقیقی معنوں میں ایسا ایشیائی شہر ہے جو رات بھر جاگتا ہے اور ٹریفک کا بہاؤ مسلسل جاری رہتا ہے یہ اطہر من الشمس ہے کہ جاپان وہ واحد قوم ہے جس نے مشین اور کلچر کے درمیان توازن برقرار رکھا ہے۔ دن تمام جاپانی فیکٹریوں اور صنعتوں اور کارخانوں میں نئے آلاجات تخلیق کرنے میں مصروف رہتے ہیں لیکن گھر میں تمدن ہی اُن کا سب کچھ ہوتا ہے، اپنے گھر کے ہر کمرے کے لئے علحدہ علحدہ چپل استعمال کرتے ہیں اور 'چائے کی تقریب' کے لئے الگ

(جاپانی چائے نہایت ادب و احترام سے پیتے اور پیش کرتے ہیں)۔اپنی ڈش کو بہت خوبصورتی کے ساتھ پھولوں اور پتیوں سے سجاتے ہیں۔کئی بار مجتبیٰ حسین صاحب اِس اُلجھن میں پڑ گئے کہ کونسی چیزیں سجاوٹ کے لئے ہیں اور کونسی کھانے کی۔جاپانی لوگ تحفے دینا بہت پسند کرتے ہیں چنانچہ مسرت و جذبات سے مغلوب مصنف یہ بتاتے ہیں کہ انہیں دئے گئے تحفوں کو گھر بھجوانے کے لئے دوبارا نہیں سامان کارگو کرنا پڑا۔

جب پروفیسر سوزوکی تاکیشی نے مصنف کو استقبالیہ تقریب کے لئے Tokyo University of Foreign Studies (TUFS) مدعو کیا تو اُنہیں یہ جان کر حیرت ہوئی کہ کئی اسکالرز عصمت چغتائی، کرشن چندر کے ادب پر ریسرچ کر رہے ہیں وہاں وہ اوساکا یونیورسٹی کے پروفیسر اَسادہ سے بھی ملے۔انہوں نے محسوس کیا کہ جاپانی اپنی زندگی کا زیادہ تر حصہ ایک دوسرے کا شکریہ ادا کرنے میں گزار دیتے ہیں، وہ بہت زیادہ شکریہ ادا کرتے ہیں اور اس دوران 60^0 کے ذاویئے پر جھک جاتے ہیں، مصنف کا خیال ہے کہ اگر وہ وہاں کچھ دن اور رہتے تو یقیناً پیٹھ کی تکلیف کا شکار ہو جاتے۔

جاپانی ٹرینس کے بارے میں کیا کہنا، حیرت انگیز رفتار کے علاوہ وقت کی پابندی مثالی ہے، یہ ٹرینس دنیا کی سب سے تیز رفتار ٹرینس ہیں جن میں اعلیٰ درجہ کی ٹکنالوجی استعمال کی گئی ہے۔یہ ٹرینس اندر سے بالکل خاموش ہوتی ہیں۔'بلیٹ ٹرین میں سفر کے دوران مصنف نے محسوس کیا س کہ وہ ایک متحرک لائبریری میں داخل ہو گئے ہیں کیونکہ سبھی مسافروں کے ہاتھوں میں کتابیں تھیں اور وہ مطالعہ میں غرق تھے۔اُنہیں مطالعہ کا بیحد شوق ہے۔حالانکہ مصنف ٹرین کی تیز رفتاری سے لفظ اندوز تو ہوئے لیکن ہندوستانی ٹرینوں میں سفر کے لوازمات جیسے شور وغل، دکھم پیل وغیرہ کو مِس کیا۔یہ اُنکے لئے اَنوکھا تجربہ رہا کہ نہ تو ٹرین اسٹیشن کے باہر سگنل کے انتظار میں رُکی، نہ ہی سامان بیچنے والے نظر آئے اور نہ ہی کوئی سوٹ کیس اُنکے سر پر گرا اور سب سے حیران کن بات یہ کہ ٹرین اپنی منزل پر بلا ایک سکنڈ کی تاخیر کئے پہنچ گئی۔

ٹوکیو سے کیوٹو کے دورانِ سفر مصنف جاپان کے حسن سے مبہوت ہو گئے، وہ سمندر سے گذرے، فیوجی پہاڑ کو دیکھا، ناگویا کے قلعہ کا مشاہدہ کیا جو دوسری جنگ میں بمباری کا شکار ہوا تھا۔

یونیسکو کی چھتری، اِس سفرنامے کا دوسرا مضمون ہے جس کا تذکرہ اکثر ادبی تحریروں میں ہوتا ہے جو اس مضمون کی مقبولیت کی دلیل ہے۔اِس مضمون میں مجتبیٰ حسین صاحب نے UNESCO کی طرف سے ملنے والی چھتری سے جڑے واقعات کا تذکرہ بڑے جذباتی انداز میں کیا ہے۔یہ چھتری انہیں جاپان کے موسمی تغیر کے پیش نظر دی گئی تھی لیکن وہ اکثر اس چھتری کو جہاں جاتے بھول آتے، مگر وہ انہیں واپس بھی مل جاتی۔انہیں یہ تاکید کی گئی تھی کہ وہ جاپان سے لوٹتے وقت اُس چھتری کو واپس کر دیں۔اس چھتری سے انکی جذباتی وابستگی کا احساس انکے اس جملے سے ہوتا ہے کہ ''آج بھی وہ چھتری ہمارے ذہن میں کھل جاتی ہے'' اور یہ کہ انہوں نے وہ چھتری جان بوجھ کر جاپان میں ہی چھوڑ دی تاکہ دوبارہ وہاں جاسکیں اور احساسِ یگانگت اور دونوں ممالک کو ایک بندھن میں باندھنے والی رسی میں اپنی خوبصورت یادوں کے موتی پُرو سکیں، اپنی خواہشوں کا تانا بانا بُن سکیں۔

اِس سفرنامے میں جاپانی آرٹ، کلچر اور پینٹنگس کا تذکرہ نہایت خوبصورت انداز میں کیا گیا ہے۔گھومتے گھامتے جناب مصنف ایک گاؤں تشریف لے گئے جس کا نام ماشاشے رون سینگ تھا جہاں انکی ملاقات مارو کی ایڈی اور مارو کی پوشی سے ہوئی وہاں ان میاں بیوی کی پینٹنگس کو دیکھا۔جنہوں نے ہیروشما کی تباہی پر 900 پینٹنگس بنائی ہیں۔ان پینٹنگس کو دیکھ کر وہ اُداس ہو گئے اور یہ تہیہ کرلیا کہ وہ ہمیشہ قیام امن کے لئے کام کرینگے۔اُن دونوں

میاں بیوی نے یہ طئے کرلیا تھا کہ تاعمر وہ ہیروشما کی تباہی کو ہی اپنی پینٹنگس میں پیش کرتے رہیں گے۔ وہاں مصنف کو دریائے گنگا کی بھی پینٹنگ نظر آئی۔ انہوں نے دیکھا کہ جاپانی عوام بہت پڑھا کو ہوتی ہے اور وہ اس عادت کے لئے ساری دنیا میں مشہور رہیں شوقِ مطالعہ میں غرق رہتے ہیں چنانچہ وہ کتابوں کی اشاعت میں بھی ماہر ہیں، یا تو وہ لکھتے ہیں یا پڑھتے رہتے ہیں لیکن گفتگو بہت کم کرتے ہیں۔ کتابوں کی دکانیں ہر جگہ پائی جاتی ہیں چاہے وہ ہوٹلیں ہوں، تفریح گاہ ہوں، اُنکے ذوقِ مطالعہ کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ وہاں کی (اُس وقت) کی آبادی 11 کروڑتھی ہر سال تقریباً 8 کروڑ کتابیں فروخت ہوتی تھیں۔

چلیئے اب جاپانی بازاروں کی سیر کرتے ہیں۔ وہاں کے بازار ہر قسم کے سامان سے بھرے پڑے ہیں لیکن مصنف وہاں سے صرف محبتوں اور خلوص کی سوغات ہی خرید پائے کیونکہ یہی وہ چیز ہے جو ڈیوٹی فری ہے اور کسٹم آفیسرز اُسے لے جانے سے نہ ہی روک سکتے ہیں اور نہ اُن خالص، ملائم اور بے غرض احساسات پر ٹیکس لگا سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ ان چیزوں کو باسانی سمگل کر سکتے تھے۔ جاپان کے بازار ہر قسم کے الکٹرانک اشیاء سے معمور ہیں۔ ساری دنیا میں لوگ جاپان کی سیکواورسٹی زن گھڑیوں، کیلکولیٹرز نیشنل اور پینا سونک ریڈیوز اور دوسرے آلہ جات (اس وقت موبائل فونس، لیپ ٹاپس وغیرہ نہیں تھے) ہیٹاچی اور سونی پڑاڈکٹس، ایشیکا کیمرے، ٹویوٹو اور ڈاٹسن کاروں سے تو واقف ہیں لیکن وہاں کے ادیب، فنکار، فائن آرٹس اور تہذیب سے نا واقف ہیں۔ دانشوروں کو اس بارے میں غور کرنا چاہئے کہ جاپانیوں کو صرف ماہر الکٹرانک ہی کے طور پر نہ دیکھا جائے بلکہ انکے آرٹ، کلچر، ادب اور دیگر فنونِ لطیفہ کے لئے بھی پہچانا جائے۔ اسکے برخلاف ہندوستان، حالانکہ کیمرے اور کاریں بنانے میں بہت زیادہ مہارت نہیں رکھتا لیکن اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے علاوہ کالی داس، رابندر ناتھ ٹیگور، کبیر، میرابائی، امیر خسرو، غالب اور ڈاکٹر اِقبال کے لئے شہرت رکھتا ہے۔ وہاں اب بھی قدیم جاپان زندہ ہے جہاں عورتیں کیمونو پہنتی ہیں۔ گیشا لڑکیاں بھی موجود ہیں۔ کانن کا مشہور زمانہ بدھسٹ مندر جو کہ 7 ویں صدی میں لکڑی سے بنایا گیا تھا، آساکوسا میں اب بھی عقیدت مندوں سے بھرا رہتا ہے جہاں عبادت کرنے کا طریقہ بالکل ویسا ہی ہے جیسا کہ ہندوستان میں مروّج ہے۔

ٹوکیو کے دو علاقے گانزا اور شنجو بڑے مشہور ہیں۔ جاپانی زبان میں گانزا چاندی کو کہتے ہیں اور یہ علاقہ بھی چاندی ہی طرح چمکتا ہے۔ شنجو کا نام لیتے ہی مصنف کے دل سے ایک سرد آہ نکلتی ہے کہ وہاں کے حسن کو الفاظ کا جامہ نہیں پہنایا جا سکتا، وہاں کی پر لطف شامیں، اونچی بلڈنگیں مسحور کن ہیں خصوصاً نومرہ بلڈنگ۔ جہاں مجتبیٰ حسین صاحب نے اپنی باقی کی شامیں گزاریں۔ اُس بلڈنگ کی پچاسویں منزل سے وہ فیوجی پہاڑ کا نظارہ کرتے، اُس پہاڑ کو اُنہوں نے اتنا دیکھا (گھورا) کہ لگتا تھا جیسے ماؤنٹ فیوجی کی چوٹی پر جمی برف اُنکی نظروں کی تمازت سے پگھل گئی ہو، اس خیال کے ساتھ ہی ان کا دل بھی پگھل کر آنسوؤں میں تبدیل ہو گیا اور نظر دھندلا گئی۔

وہاں سے وہ بے حساب محبتیں کو تو سمیٹ لائے ہی تھے لیکن ڈائیریکٹر جنرل آف سنٹرل آف ایشین کلچر (جناب ایٹوکی) (یونیسکو) کا خلوص و کی دعائیں اور شفقتیں بھولے نہیں بھولتیں۔ کیونکہ اکثر جب بھی وہ سیمینار میں شرکت کے لئے جاتے، وہ اکثر مصنف کی کرسی پر تحفے چھوڑ جایا کرتے۔ ایٹوکی نے انہیں گیشا پارٹی پر بھی بلایا تھا جو ایک ناقابل فراموش موقع تھا۔ گیشا پارٹیاں بہت پر لطف ہوتی ہیں۔ جناب مجتبیٰ حسین کی ملاقات جاپان کے مشہور گلوکار سا گاہارا سے یونیسکو کی ایک تقریب میں ہوئی

تھی، جاپانی لوگ ہندوستانی میوزک کو پسند کرتے ہیں۔ ساگاہارا نے بھی مصنف کے لئے ایک پارٹی رکھی جہاں انہیں اسنیکس کے طور پر ٹڈّے کھانے کو ملے جو پہلے تو انہوں نے کھالئے تھے بعد میں ان سے چھٹکارا حاصل کرلیا۔ اس واقعہ کے بعد جب بھی مصنف کوئی ٹڈّا دیکھتے ہیں تو انکے ذہن میں ساگاہارا کی یاد بھی ٹڈّے کی طرح اُچھل پڑتی ہے۔

اِس سفرنامے میں مجتبیٰ حسین صاحب نے جاپان سے متعلق تقریباً ہر پہلو کا جائزہ لیا اور پیش کیا ہے۔ چاہے وہ وہاں کی تہذیب وتمدن ہو، سماجی زندگی ہوں، عادات و اطوار ہو، تعلیمی ماحول ہو، آرٹ، کلچر، ٹکنالوجی، طرزِ معاشرت، غذائی عادات، رہن سہن، بازار، تیز رفتاری، وقت کی پابندی سبزہ و پہاڑ، لا اینڈ آرڈر، تاریخی پس منظر، لوگوں کی ایمانداری غرض یہ کہ جتنے وقت وہ وہاں رہے، ہر چیز کا بغور مطالعہ کیا اور قلم بند کیا۔

کیوٹو اور نارا کے پگوڑا جاپانی تاریخ کی عکاسی کرتے ہیں، اُن سے وہاں کا تاریخی پس منظر چھلکتا ہے، دیکھنے لائق ہیں اور مبہوت کر دینے والی خوبصورتی رکھتے ہیں۔ جاپان کی موجودہ ترقی کا سہرہ میجی (Meiji) دورِ حکومت کا مرہونِ منّت ہے، 1868ء سے پہلے تک جاپان تک ایک غیر اہم ملک کی حیثیت رکھتا تھا لیکن میجی (Meji) بادشاہ کی ترقی پسندانہ پالیسیوں کی وجہ سے وہاں لا اینڈ آرڈر کی تو غیر معمولی پایا جاتا ہے۔ عام طور پر شہر پرامن ہی رہتا ہے اور جرائم کی شرح پر کم ترین ہے حالانکہ وہاں پولیس بہت کم نظر آتی ہے۔ اِسکے برخلاف ہندوستان میں پولیس ہر جگہ دِکھائی دیتی ہے لیکن اَمن واَمان کم ہی نظر آتا ہے۔

مصنف جاپانیوں کے کردار، تہذیبی رکھ رکھاؤ، سخت محنت، ایمانداری سے بہت متاثر ہوئے اور اپنے ساتھ بے حد خوبصورت یادیں، شکرگزار دل اور جذباتی ہم آہنگی لے کر لوٹے۔ وہ آخر میں جاپان جانے والوں سے گذارش کرتے ہیں کہ وہ وہی جذباتی وابستگی سے چیزوں کو دیکھیں، اُنکی آنکھوں سے ماؤنٹ فیوجی کے حُسن کو سیمیٹیں، نومرہ بلڈنگ کی پچاسویں منزل کی ریلنگ کو جب ریلنگ بھی تھامیں آنکھیں بند کر کے وہاں مصنف کی اُنگلیوں کا لمس محسوس کریں۔ یہ جذبات کی تپش سے لبریز الفاظ مصنف کی وسیع القلبی و وسیع المشربی کے غمّاز اور انسان دوستی کی مثال بن گئے ہیں جہاں زبان وملک کی تفریق کوئی معنی نہیں رکھتی۔

اس مقالے کی پیشکشی کا مقصد نہ صرف ہندو جاپان کی صدیوں پرانی تہذیبی تعلقات کو اُجاگر کرنا تھا بلکہ ان رشتوں کو مضبوط کرنے کے لئے وہاں کے اسکالر، ادیبوں، سیاحوں، سائنسدانوں، انجینئروں اور دوسرے پیشہ وروں کی خدمات کی طرف توجہ دلانا بھی تھا۔ مقالے کے ابتدائی حصہ میں جاپان کے اردو اسکالرز اور پروفیسرز کی اردو کے فروغ کے لئے کی گئی انتھک کاوشوں کا ذکر کیا گیا ہے جنہوں نے وہاں اردو کی مقبولیت کے لئے بے تکان کام کیا، اس سلسلے میں انکی محنت و جوش و جذبہ لائق تحسین ہے۔ ہندوستان میں بشمول اردو ادیب شائد بہت کم لوگ علم رکھتے ہونگے کہ جاپان میں اردو نہ صرف بہت مقبول ہے بلکہ وہاں شاعروں کا اہتمام بھی ہوتا ہے۔

مقالے کے دوسرے حصے میں مقبول خاص وعام و بے مثال طنز ومزاح نگار پدم شری مجتبیٰ حسین کے سفرنامے سے اِقتباسات پیش کئے گئے جس میں جناب نے جاپان کی جیتی جاگتی شبیہ دکھلائی ہے۔ قارئین کو نہ صرف وہاں کے رہن سہن، رکھ رکھاؤ کے بارے میں علم ہوتا ہے بلکہ ہر شعبہ حیات میں انکی بے پناہ ترقی کے بارے میں بھی معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ 'جاپان چلو، جاپان چلو، کا جاپانی' زبان میں اردو کی اسکالر مسز ساشور نے اردو میں ترجمہ کیا ہے جو وہاں بھی کافی مقبول ہو چکی ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے غیر معمولی طرزِ لگارش اختیار کیا ہے، اس طرح کا مزاحیہ سفرنامہ نادرالوجود ہے۔ اسمیں باریک سے باریک پہلوؤں

پر روشنی ڈالی گئی جس سے اسکالرز میں بالخصوص اور عوام بالعموم وہاں جانے کی خواہش ہوتی ہے۔ مزاح کے امتزاج نے اس سفرنامے کو ایک شاہکار بنا دیا ہے کانفرنس میں جاپانی مندوبین بہت حیران ہوئے کہ مقالے میں جن اردو اسکالرز کا تذکرہ کیا گیا ہے ان میں سے بیشتر کی ملاقات مجتبیٰ حسین صاحب سے جاپان میں (1980) ہوئی ہے، اور یہ کہ جاپانی، ہندوستانی ادیبوں اور فنکاروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ مصنف کا رزندہ دِلی سے لبریز خفیہ طنز، گدگدانے والا مزاح اور چست فقروں نے اسکو منفرد بنا دیا ہے۔

کتاب سے لئے گئے اقتباسات کو من وعن شامل کرنے کے بجائے بیانیہ انداز اختیار کیا گیا چونکہ کانفرنس میں جاپانی مندوبین موجود تھے اور انہیں اس سفرنامے کے اقتباسات کے ذریعہ یہ بتانا مقصود تھا کہ ایک بے مثال مزاح نگار نے انکی علمی، تہذیبی، معاشرتی زندگی کا (اتنے کم وقت میں) نہ صرف بغور مطالعہ کیا ہے بلکہ ان واقعات میں سے بغیر کسی نکتہ چینی کے مزاح کا پہلو بھی تلاش کیا ہے۔ چنانچہ صرف اسے اِقتباسات جو بالخصوص جاپانی مندوبین کی دلچسپی کا باعث ہو سکتے تھے اُنکو شامل کیا گیا۔ ساتھ ہی جاپان اور اردو کے گہرے رشتے کو بھی واضح کرنا بھی ایک مقصد تھا اور یہ بھی کہ ماضیٔ قریب میں اس لسانی اور ادبی رشتہ کو جناب مجتبیٰ حسین نے اپنے اس مقبول ترین سفرنامے کے ذریعے مضبوط کرنے میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔

اُس کانفرنس میں شریک ہندوستانی مقالہ نگاروں نے بھی جاپان میں اردو کی مقبولیت پر حیرت کا اظہار کیا جبکہ اردو (جنوبی ہند، جہاں کانفرنس منعقد ہوئی) کے اُس حصے میں بہت کم بولی جاتی ہے۔ مقالہ نگار نے پڑھنے کے دوران سامعین کو اکثر مسکراتے دیکھا۔

اس مقالے کو بالخصوص جاپانیوں نے بیحد پسند کیا اور انکی کاپیاں بھی حاصل کیں جو دراصل انگریزی میں تحریر کیا گیا تھا۔

نوٹ- یہ مقالہ UGC Centre for Southeast Asian and Pacific Studies - Sri Venkateshwara University - Tirupati - A.P - میں International Conference of India منعقدہ Japan Relations - IJR-TPP - India Japan Relations Transforming into Potential Partnership میں پڑھا گیا۔

نخلستان کی تلاش، ''ایک ممنوعہ محبت کی کہانی''

''خدا کے سائے میں آنکھ مچولی''

کے بعد

رحمٰن عباس

کا

تہلکہ خیز ناول

روحزن

قیمت:-/350

ملنے کا پتہ:

ممبا بکس انڈیا، ممبئی

0932226262

عرشیہ پبلی کیشنز۔ نئی دہلی

عمران عاکف خان

مضمون

اسرار گاندھی کے افسانوں کا استعاراتی نظام

اردو افسانے کی روز اول سے ہی یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ اپنے یوم آغاز سے ہی ترقی پذیر رہا ہے، جیسے جیسے اسے موقع ملا ہے، وہ بازار کے سینسکس کی مانند اچھلا ہے اور اس نے معاشروں اور علاقوں پر اپنی اثر کاری کی ہے۔ اس کی اثر کاری سے معاشرے اور سماج سدھرے ہیں اور انقلابات سے دوچار ہوئے ہیں۔ اردو افسانے اب تک متعدد تحریکوں اور رجحانات کی کسوٹی اور بھٹی سے ہو کر نکلا ہے۔ وہ ان مرحلوں سے گزر کر کندن ہی بنا ہے اور اس کی رعنائی وصفا میں اضافہ ہی ہوا۔ چنانچہ آج اردو افسانہ جب کہ اپنی عمر کے 120 برس گزار چکا، وہ نہایت موثر، انقلاب آفریں، جاذب نظر، جذبات کا ترجمان، زندہ باد موضوعات کا منبع اور تحریکی وتبدیلی حسیات کا مالک بنا ہوا ہے۔ وہ اپنے اندرون میں متعدد نظاموں اور اصولوں کا حامل ہے اور اپنے قارئین کو اپنے طریقوں پر چلانا جان چکا ہے۔ بلکہ وہ اس کی تبلیغ بھی کرتا ہے۔ امروز تو اسے زبان بھی مل چکی، جس کے ذریعے وہ نکیر بھی کرتا ہے اور بشارتیں بھی سناتا ہے۔

معروف افسانہ نگار اور علم وادب نواز جناب اسرار گاندھی کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ وہ اردو فکشن کی مقبول ترین صنف ''صنف افسانہ'' کی ایک اہم ترین کڑی تصور کیے جاتے ہیں۔ انھیں فکشن نگاری کے لیے متعدد ایوارڈ اور انعامات و اعزازات سے نوازا جا چکا ہے۔ مختصر یہ کہ شہر سنگم یا شہر اکبر وفراق اور شمس الرحمان فاروقی، الہ آباد سے ان کا تعلق ہے۔ ان کا شمار 80 کی دہائی میں ابھرنے والی ان ہستیوں میں ہوتا ہے جنھوں نے تجریدی الجھنوں اور گورکھ دھندوں سے سے ماوریٰ جدید افسانے کی بنیاد ڈالی اور اسے پروان چڑھایا۔ یہ دور سرمایہ داری، جدید ٹیکنالوجی، صنعتی انقلاب، کنزیومرازم کی سربراہی، دنیا کی بڑی طاقتوں کی چھوٹی طاقتوں کو ثابت نگل جانے اور ان کے وجود کو مٹانے کے حربوں ومنصوبوں نیز سماجی اقدار کی پامالی کا دور تھا۔ اسی دور میں براعظم ایشیا شکست وریخت اور طوائفی الملکی کا دور دورہ تھا۔ تیس چالیس قبل وجود میں آئی نئی مملکت ''پاکستان'' کے آئین کو بھی بنے ہوئے ابھی دس برس ہی گزرے تھے اس پر بھی وہاں سیاسی و جمہوری قدروں کی پامالی کا دور ابھی تک تھما نہیں تھا۔ ایسے وقت میں ہر دن نت نئے مسائل و مصائب نے بالخصوص ایشیا کی مشرقی اقدار و روایات کو نگلنا شروع کر دیا تھا۔ مشرقی اقوام اس یلغار کا مقابلہ نہ کر سکیں۔ اس کا اثر بیرونی اور بین الاقوامی سماجی دھاروں پر پڑنے کے ساتھ ساتھ خانگی اور نجی زندگیوں پر پڑنے لگے۔ چنانچہ نئی روشنی کی زد میں آنے سے قدیم اور مضبوط سے مضبوط رشتے ناتے کچے دھاگے کی مانند ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرنے لگے۔ اس طوفان بلاخیز کی زد میں آ کر ایک بڑا طبقہ بے سمت روش میں بہتا چلا گیا۔

تاہم ایسے ناگفتہ بہ اور کاینات کے سکوت میں ہلچل مچا دینے والے وقت اور ماحول میں ایک طبقہ موجود تھا جس نے وقت کے برہم گیسوؤں کو سنوارنے کا عزم کیا۔ اسے ادیبوں، شاعروں، دانشوروں اور سماج کے حساس ترین افراد کا طبقہ کہا جاتا ہے۔ اس طبقے نے عظمت رفتہ کا سراغ لگانے اور آفاقی قدروں کو بحال کرنے کے لیے اپنی جان تک کی بازی لگا دی۔ اپنا قلم، اپنی فکریں اور اپنے احساسات اس کے لیے وقف کر دیے۔ انھوں نے قدروں کی بحالی کے ساتھ ساتھ مغربی چمک دمک کی اصلیت سے آگاہی بخشی اور اپنے قلم، اپنی کاوشیں، اپنی محنتیں و جدو جہد سب اس کے نام کر دیں۔ انھوں نے بر وقت سامراجی قوتوں کے ناپاک منصوبوں اور صنعتی و ٹیکنالوجی کے

انقلاب کی آڑ میں کی جانی والی غیر انسانی منصوبہ بندیوں کا قلع قمع کیا۔ بین الاقوامی طبقاتی و انسانی نابرابریوں کی خلیجوں کو پاٹا اور اس عمل نامناسب کے مرتکبین کو درس انسانیت و اتحاد دیا۔ انھوں نے بتایا کہ افریقہ کے کالے بھی انسان اور ریڈ انڈینس کی رگوں میں بھی لال خون گردش کر رہا ہے۔ ایشیا میں بسنے والے افراد بھی آدم اور منو کی اولاد ہیں اور کیتھولک و آسٹرولک طبقات و مذاہب کے پیروں کاروں کو ان پر کسی بھی قسم کی افضلیت و برتری حاصل نہیں ہے۔ ہاں انسانیت کا دوسرا مذہب یکسانیت اور برابری ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور مذہب نہیں۔ چنانچہ اس کے مثبت نتائج برآمد ہوئے اور مشرقی قدریں مغربیت کی زد میں مکمل آنے سے بچ گئیں۔ مگر ان ادیبوں کی اس نئی اور پیمبرانہ تبلیغ پر انھیں سماج و مذاہب کے بڑے وطاقت ور طبقات کے ذریعے عقوبتوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ انھیں دشمنیاں اور نفرتیں بھی ملیں۔ انھیں آبادیوں سے باہر نکال دیا گیا اور ان کے لب سی دیے گئے۔ ہاتھ قلم کر دیے گئے۔ قرطاس اور کتابوں کے ذخیروں میں آگ لگا دی۔ تاہم پھر بھی وہ جیالے حد جنوں سے گزر گئے۔

زیریں سطور میں ایک ایسے ہی ادیب ''اسرار گاندھی'' کا تذکرہ ہے جو اسی کاروان سرفروشاں کے راہی بلکہ نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے 80 کی دہائی میں اپنے فن کا آغاز کیا اور استعاراتی زبان میں ایک نیا طریقہ گفتگو ایجاد کرتے ہوئے سنگلاخ راہ چن کر اسے گلزار بنا دیا۔ اب اس روش پر چلتے ہوئے کنکر، پتھر یا کانٹے نہیں چبھتے بلکہ پھولوں کی مہنک راہی کا استقبال کرتی ہے۔ اسرار گاندھی کے افسانوں کی مجموعی فضا سماج نابرابری، غیر ذی روح حقیقتوں کی بے حسی یا احساس۔ ملکوں کا اثاثہ سمجھے جانے والے افراد کی بے راہ رویاں، ان کے پنپنے اور سانس لینے کے طریقے اور ہماری زندگیوں میں ان کی عمل کاریوں و اثرات پر مشتمل ہے۔

ان کے افسانے دل کی آواز اور ہمارے اندرون کا آئینہ ہیں۔ انھوں نے چھوٹے چھوٹے اور بالعموم نظر کر دیے جانے والے موضوعات اور ایشوز کو اٹھا کر انھیں زبان احساس دی ہے اور شرح آرزو کا موقع فراہم کیا ہے۔ میری میز پر موجود ان کا —— ''ایک جھوٹی کہانی کا سچ اور دوسرے افسانے'' ایسے ہی افسانوں اور کہانیوں کا مجموعہ ہے جس میں میرے خیال کی تائیدی مثالیں ہیں۔ یہ کہانیاں اپنی ترجمانی خود کرتی ہیں اور اپنا مدعا آپ ہی بیان کرتی ہیں۔ کیوں کہ افسانہ نگار نے بھی انھیں زبان دی ہے اور انھیں ہنر تکلم سکھایا ہے۔ وہ خود بھی کہتے ہیں:

> میں اس انتخاب میں شامل اپنی کہانیوں کے تعلق سے کوئی بات نہیں کروں گا۔ یہ کہانیاں خود آپ سے مکالمہ کریں گی اور آپ کو کسی نتیجے پر پہنچنے میں مدد کریں گی۔ یقین ہے آپ جن نتائج پر پہنچیں گے، ان کا اظہار ضرور کریں گے۔ (اسی کتاب سے۔ ص:6)

اس اقتباس کی آخری شرط کی ادائیگی قاری پر قرأتی فریضہ ہے۔ کیوں کہ ہر مصنف کی خواہی نہ خواہی چاہت ہوتی ہے کہ اس کا درد سانجھا ہو۔ اس کی پیتا سب کی پیتا بنے اور اس کے کرب کو سب اپنا کرب مانیں۔ اس کی لے میں سب لے ملائیں اور اس کی فغاں کو سب اپنی فغاں مانیں۔ وہ اپنے احساسات، وہ اپنے جذبات اور اپنا وقت اپنے لیے نہیں بلکہ قاری اور سماج کے ہر فرد کے لیے صرف کرتا ہے۔ وہ چنانچہ اس کی تحریر سے متاثر ہونے، اسے اپنانے اور اسے آفاقی حیثیت دینے میں سب کو حصے داری نبھانی چاہیے۔

اس مجموعے میں شامل کئی افسانے تو جگر چیر گئے۔ ''پرت پرت زندگی''۔ ''وہ جو راستے میں کھو گئی''۔ ''مارکٹنگ''۔ ''خلیج''۔ ''نالی میں اگے پودے''۔ ''شاور کا شور''۔ ''کھلی آنکھوں کا خواب'' یہ ان سے سوا ہیں۔

کہانی کی بنت ،ہیئت،نفس مضمون،واقعے کی تحلیل نفسی،نفس الامر میں اس کا وجود،اسلوب بیاں،غیر معروف جزیات کا عرفی حیثیت سے بیان،مختصر لفظوں میں بڑی بات کہہ جانا، جمادات کو بھی آمادۂ اظہار خیال کرنا وغیرہ اسرار گاندھی کے فکشن اور افسانوں کے خصوصی اوصاف و امتیازات ہیں۔ان کی Stylist تحریروں بولتی ہیں کہ اسرار گاندھی میں زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے بلکہ اس کا نام پتا بھی پوچھا ہے۔اس کا آغاز و انجام بھی جانا ہے اور اسے متعدد مقامات پر بھٹکنے سے بھی بچایا ہے۔اسے اپنے گھر مہمان بھی بنایا اور ہے اور اس کی خاطر داری بھی کی ہے۔اس کی عصمت وعفت بھی غنڈوں سے بچائی ہے اور اسے ردائے حیا بھی اوڑھائی ہے۔کہیں کہیں تو ایسا لگتا ہے کہ کسی نوعمر اور شباب آمدہ بیٹی کی مانند زندگی ان کا ہاتھ تھام کر چلی ہے اور کہیں کہیں اس نے ان سے راستہ پوچھا ہے۔''پرت پرت زندگی'' ایک ایسی ہی کہانی ہے جس میں زندگی کے یہ روپ نظر آتے ہیں۔چنانچہ درج ذیل سطور اس کا بیان ہیں:

> میں تم اور وہ محسوس تو اور بھی بہت کچھ کرتے ہیں۔بکھرتی ہوئی قدریں،ٹوٹتے ہوئے انسانی رشتے،ہیروشیما پر گرایا گیا ایٹم بم،بے آواز چیخ و پکار،اندر کا کھوکھلا پن،نفرت،دکھاوے،بھوک،پیاس،آنسو اور نہ جانے کیا کیا۔ (اسی کتاب سے۔ص:30-29)

زندگی کے یہی روپ ہیں۔پرت پرت بدلتی زندگی ان ہی راستوں پر چلتی ہے۔وقت اور حالات کی مانند یہ نہایت تیزی اور بے رخی سے بدل جاتی ہے یا وقت اور حالات اسی سے مستعار ہیں۔

اس مجموعے میں شامل کہانی ''کہرے سے ڈھکی ایک رات''زندگی کے ایک ایسے ہی رنگ کی کہانی ہے۔جب زندگی بھٹک گئی تھی۔اس کے سامنے اندھیرے آ گئے تھے اور وہ دیواروں سے سر ٹکراتی پھر رہی تھی۔اسے کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔اسے گلے سے لگانے والے ہوس کاروں نے اسے نوچ کھسوٹ کر پھینک دیا تھا اور اس کے مرمریں جسم کے آبگینے چور چور کر کے اسے کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیا تھا۔جب اسے ہوش آیا تو پورا شہر دھواں دھواں بن کر اس کی آنکھوں کو جلا رہا تھا۔

یہ ایک زندہ حقیقت ہے کہ ہمارے شہروں میں فضائی آلودگی،اس کی فضا پر جمی کثافت کی تہیں اور اداس ہوائیں ایک دن ہم پر ہی حملہ آور ہوتی ہے۔اس کی پاداش میں پھیلانے والے طاعون اور وائرسوں کی زد میں ہم ہی آتے ہیں اور ہمارے ساتھ معصوم مخلوق۔اکثر ہمارے شہروں کے افق پر ایسا اندھیرا چھاتا ہے کہ ہمیں اپنا وجود ہی اجنبی لگنے لگتا ہے۔اور وہ اپنے ہی ہیولے سے ڈر جائے۔پھر ایسے اندھیرے میں جرائم پیشہ عناصر کی جرائم کاریاں عروج پر پہنچ جاتی ہیں۔ایسے ماحول میں ہی زندگی تھک کر بیٹھ جاتی ہے یا چاروں طرف پیشانی پر ہاتھ کا چھجا بنا کر راہیں تلاش کرتی ہے۔اسرار گاندھی کہرے سے ڈھکی رات کی منظر کشی اس اچھوتے ڈھنگ سے کی ہے کہ وہ انداز یادگار اور ناقابل فراموش بن گیا۔ایک منظر دیکھیے:

> دم گھٹنے کا یہ تجربہ اس کے لیے نیا نہ تھا۔نہ جانے کتنی بار اس نے پہلے بھی اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس کیا تھا اور نہ جانے کتنی بار پھڑ پھڑاہٹ محسوس کی تھی لیکن اس وقت کی گھٹن اور پھڑ پھڑاہٹ بڑی جان لیوا ثابت ہو رہی تھی ۔اس نے پوری قوت سے اپنے پھیپھڑوں میں جان بھرنے کی کوشش کی لیکن اس عمل سے اس کی تکلیف کم ہونے کے بجائے اور بڑھ

گئی۔....(اسی کتاب سے۔ص:17)

حالاں کہ یہ کیفیات یہ کیفیت افسانے کردار سائیکل سوار کی ہیں مگر یہ بھی بعید نہیں کہ انھیں زندگی کا بھی استعارہ تصور کر لیا جائے۔ جو کبھی ایسے ہی مقام پر آ کر حواس باختہ ہو جاتی ہے اور اس کا دم اس کے اندرون میں ہی گھٹتا محسوس ہوتا ہے۔ اسی دم کوئی مسیحا یا خضر راہ آتا ہے اور اس کی سانسیں درست کر کے اسے نشان رود بتاتا چلا جاتا ہے۔ اسرار گاندھی نے حقیقت اور مجاز دونوں امور نہایت حسن خوبی سے انجام دیے ہیں اور تھکی تھکی سی، اداس اداس سی زندگی نے متعدد باران کے فکر وفن سے نئی زندگی اور نئی رفتار حاصل کی ہے۔

اسرار گاندھی کے دوسرے افسانوں میں بھی استعاراتی نظام بہت مضبوط ہے۔ وہ ہوش مند ہیں کہ راست انسانوں اور گناہ گاروں سے مخاطب نہ ہو کر دیگر مخلوقات و مصنوعات کو جسم و جان، روح وعناصر عطا کر کے انھیں ہدف تنقید بناتے ہیں اور ان کے محور میں روشنیاں بھر کر ان اندھیریوں اور شبستانوں کو روشن کرنا چاہتے ہیں جہاں برائیوں اور بد پرہیزیوں کے انبار لگے ہوں ۔چنانچہ دیکھیے ''نالی میں اگے پودے'' افسانے کے یہ دل کشا اقتباسات:

> اس نے سوچا کہ یہ جو چھے سات خواتین اساتذہ پڑھانے کے لیے آ گئی ہیں، ان کی وجہ سے کالج کے ماحول میں خاصی تبدیلی آ گئی ہے۔ کچھ لوگ جو ہفتوں اپنی داڑھیاں نہیں بناتے تھے، اب روز ہی بنانے لگے ہیں۔ کچھ دوسرے لوگ جنھیں میلے کچیلے اور شکن آلود کپڑے پہن کر کالج آنے میں کوئی عار نہ تھا ،اب قدرے بہتر اور اچھے کپڑوں میں دکھائی دینے لگے تھے۔ اتنا ہی نہیں، کئی نے تو اسپرے سینٹ کا استعمال کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔ اور سب سے بڑی بات تو یہ ہوئی تھی کہ کالج کے چند اساتذہ جو ڈھکے چھپے طریقوں سے خوب صورت لڑکوں میں دل چسپی رکھتے تھے اور اپنے غیر فطری مذاق کے لیے جانے جاتے تھے، نے بھی اپنے چولے بدل لیے تھے۔(اسی کتاب سے۔ص:112)

ایک اور...

> انجو اور پرشانت دونوں ہی کئی کئی بچوں کے ماں باپ تھے لیکن انجو اپنے شوہر سے پریشان تھی تو پرشانت اپنی بیوی سے عاجز۔ پھر یہ تو ہونا ہی تھا لیکن اس رومانس سے کالج کی فضا گرد آلود ہونے لگی تھی۔ اسٹاف روم میں ہر وقت ان ہی باتوں کا چرچا رہتا اور جب یہ چرچا کبھی کبھی غلاظتوں کے درمیان سے ہو کر گزرنے لگتا تو اسے بڑا جھٹکا لگتا۔ اسے محسوس ہوتا کہ جیسے کالج کیمپس کا ماحول بے حد مار بڈ (morbid) ہوتا جا رہا ہے۔ اس بات سے اسے بڑی گھٹن محسوس ہونے لگی تھی۔(اسی کتاب سے۔ص:115)

ہمارے تعلیمی اداروں کی جو حالت ہے اور طلبا ا ور طلبا، اساتذہ اور اساتذہ کے جو جنسی اور ہر قسم کے تعلقات ہیں، ان سے کون ناواقف ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ان اداروں میں درس اخلاق پامال ہوتے ہیں اور قدروں کا جنازہ آئے دن نکلتا ہے۔ اسی اگر ان میں پنپنے والے ان عناصر کو ''نالی میں اگے پودے'' نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے۔ یہ پودے ایسے ہوتے ہیں جن سے نہ تو فضا کا توازن و ماحول درست ہوتا ہے اور نہ ہی وہ

کارآمد ہوتے ہیں۔نالی اگر بہتی رہی تو ہرے بھرے اور تازہ ہیں، جہاں نالی سوکھی،ان کی تمام تر صلاحیتیں مرگئیں اور وہ محض کوڑا کرکٹ ہوکر رہ گئے جس سے شہر کی آلودگیوں اور کثافتوں میں ہی اضافے ہوتے ہیں۔

قصہ مختصر یہ کہ یہ مجموعہ حرف اول سے آخر تک ان ہی احوال واقعی اور زندگی کی تلخ حقیقتوں پر مبنی ہے۔افسانہ نگار نے استعارے کے پیرائے میں ان ناسوروں کو مندمل کرنے بھرپور کوشش کی ہے اور اس میل کچیل کو صاف کیا ہے جس سے اب کوئی جگہ اور مقام بھی محفوظ نہیں ہے۔اس طرح راست تکلم کے بجائے استعارے کا نظام ان کے یہاں ایک مضبوط حیثیت اختیار کر گیا ہے۔دوسری خوبی یہ ہے کہ انھوں نے ایسی ہی استعاراتی خوب صورت زبان استعمال کی ہے جس کی اثر پذیری براہ راست گوئی سے زیادہ ہوتی ہے۔نیز تفہیم وترسیل بھی۔

☆☆☆

مجتبیٰ حسین کے بارے میں دو ضخیم کتابیں شائع

فن اور شخصیت پر ممتاز اہل قلم کی تحریریں

بین الاقوامی شہرت یافتہ طنز ومزاح نگار مجتبیٰ حسین کی ادبی زندگی کے پچاس سال مکمل ہونے پر ملک کے نامور پبلشر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤز دہلی نے مجتبیٰ حسین کی شخصیت اور فن پر دو نہایت مبسوط کتابیں شائع کی ہیں جن کے نام ہیں ''مجتبیٰ حسین: جیسا دیکھا جیسا پایا'' اور ''مجتبیٰ حسین آئینوں کے بیچ''، ''مجتبیٰ حسین جیسا دیکھا جیسا پایا'' میں اس نامور ادیب کی شخصیت کے مختلف رنگارنگ پہلوؤں پر ملک اور بیرون ملک کے مشہور اہل قلم کے نہایت دلچسپ تاثراتی مضامین شامل ہیں۔یہ مضامین مختلف اوقات میں لکھے گئے تھے۔پروفیسر وحید اختر، پروفیسر گوپی چند نارنگ، خواجہ حسن ثانی نظامی، مشفق خواجہ، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، انتظار حسین، پروفیسر شمیم حنفی، فکر تونسوی، پروفیسر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر شہریار، یوسف ناظم، مرزا ظفر الحسن، پروفیسر یوسف سرمست، رفعت سروش، پروفیسر بیگ احساس، دلیپ سنگھ، نریندر لوتھر، علی باقر، کے ایل نارنگ ساقی اور کئی دوسرے اہم ادیبوں نے اپنے انداز میں مجتبیٰ حسین کو ''جیسا دیکھا جیسا پایا'' کے تحت اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔کئی شعراء نے منظوم خراج تحسین بھی پیش کیا ہے۔انگریزی میں صاحب طرز ادیب خوشونت سنگھ، محمد علی صدیقی، علی باقر، عارف حسینی، بلراج ورما اور نقی علی کے سیر حاصل مضامین شامل ہیں۔''مجتبیٰ حسین آئینوں کے بیچ''، مجتبیٰ حسین کے فن کا جائزہ ہے۔اردو کا شاید ہی کوئی ایسا اہم ناقد رہا ہو جو اس منفرد طنز ومزاح نگار کے فن سے متاثر نہ ہوا ہو۔پروفیسر آل احمد سرور، شمس الرحمٰن فاروقی، صدیق الرحمٰن قدوائی، ڈاکٹر قمر رئیس، جاپانی پروفیسر سوزوکی تاکیشی، پروفیسر مغنی تبسم، ڈاکٹر عتیق اللہ، ڈاکٹر مصطفیٰ کمال، رضیہ فصیح احمد، مصحف اقبال توصیفی، ڈاکٹر اشفاق احمد ورک، علی ظہیر، حسن چشتی، ڈاکٹر افسر کاظمی، زاہد علی خاں، من موہن تلخ، انور سدید، مخمور سعیدی، ڈاکٹر مظفر حنفی، علیم صبا نویدی، قمر علی عباسی، مظہر امام اور کئی دوسرے نقادوں نے مجتبیٰ حسین کے فن کا جائزہ لیا ہے۔مجتبیٰ حسین کے فن کے بارے میں بے باکانہ انٹرویوز ایک مستقل باب کی حیثیت رکھتے ہیں جن میں زبیر رضوی، کمار پاشی، رشید انصاری، حامد اکمل، طاہر مسعود، فیروز عالم، حلیمہ فردوس اور کئی باریک بیں اصحاب کے نام آپ کو ملیں گے۔دونوں کتابیں اہم اور یادگار تصاویر سے مزین ہیں۔کتابت طباعت نہایت دیدہ زیب ہے۔ان دونوں کتابوں کو سید امتیاز الدین اور محمد تقی نے مرتب کیا ہے۔ہر کتاب کی قیمت ساڑھے چار سو روپے رکھی گئی ہے۔ان کتابوں کو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس 3108 وکیل اسٹریٹ، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی 6 اور ملک کے اہم بک اسٹالوں سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

نوشاد کامران

مضمون

خواب اور خلش (جاں نثار اختر کے حوالے سے)

جاں نثار اختر کا شمار ان چند شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے شاعری کو زندگی میں نہیں برتا بلکہ زندگی کو ہی شاعری بنا کر گذار دیا۔ ان کی شاعری میں زندگی کی گوناگوں خصوصیات تابناک صورت میں موجود ہیں۔ بچپن کی شوخی، شرارت، نوجوانی کی امنگیں، پختہ عمر کی سنجیدگی ومتانت، اور سن رسیدہ شخص کا غور وفکر اور یک گونہ بے خودی کا احساس ان کے کلام میں جگہ جگہ موجود ہیں۔ ان کے یہاں نظموں اور غزلوں میں زندگی کو سمجھنے اور انسان کے دکھ کا مداوا کرنے کا رجحان ملتا ہے۔ انھوں نے جہاں آنکھوں میں پلتے خوابوں اور خواہشوں کو انسان کی پریشانیوں کی سب سے بڑی وجہ بتائی تو وہیں خوابوں سے یکسر بیزاری پر تنبیہ بھی کی اور خوابوں کے بغیر آدمی کو آدھا ادھورا تصور کیا ہے ؎

ہمارے خواب بھی بہلا سکے نہ آج ہمیں
جو رو لئے ہیں تو کچھ جی بہل گیا ہے میاں

یا

دنیا کی کسی چھاؤں سے دھندلا نہیں سکتا
آنکھوں میں لئے پھرتے ہیں جو خواب سحر ہم

بات خواب سحر کی ہو یا خوابوں کے سحر کی، انسان کی زندگی میں خوابوں کے کردار اور اس کے مختلف معنوی امکان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ خواب، یعنی اس مادی دنیا سے پرے ذہنی اختراع یا کرشماتی تصورات کی دنیا، جہاں ہر چیز ممکن العمل ہے۔ کبھی خواب ہمارے لئے فرحت بخش ہوتے ہیں تو کبھی باعث عذاب بھی۔ خوابوں کی تکمیل جہاں ہماری روحانی آسودگی کا باعث ہوتی ہے وہیں ناتمام آرزوئیں کبھی کبھی مسلسل خلش کی صورت اختیار کر کے دل ودماغ میں سلگتی رہتی ہیں۔ ولی سے کر فیضؔ اور فرازؔ تک کم وبیش تمام شعرا کے یہاں خوابوں کی اہمیت مختلف صورت میں جلوہ گر ہوئی ہے۔ ولی نے جہاں خوابوں کے دیکھنے کو غفلت شعاری سے تعبیر کیا ہے وہیں غالب نے تصور جاناں میں عمر گذرانے کی خواہش ظاہر کی ہے، فراق سنسان راتوں میں محبوب کی یادوں کی چادر تان کر عافیت محسوس کرتے ہیں۔ ناصر کاظمی نے زندگی کی کڑی دھوپ میں خیال یار کا سہارا مانگا، فیض یاد غزال چشماں اور ذکر سمن عذاراں سے کنج قفس کو لالہ زار بناتے ہیں، سردار جعفری کے یہاں بھی آرزو، صنم خانے سجاتی ہے، احمد فراز خواب کی بازی کھیلتے ہیں اور نتیجے میں ملے زخموں کو برسر عام بھی کرتے ہیں۔ الغرض یہ ایک ایسا مرکز ہے جہاں ہر پھر کر ہر شاعر پہنچتا ہے۔ جاں نثار اختر کا مرغ تخیل بھی بار بار خوابوں کی وادی پر پر مارتا ہے۔ ان کے یہاں بھی خواب وسیع معنوں میں آیا ہے اور خوابوں کی رنگینی، حلاوت اور خوابوں کے ٹوٹ کر بکھرنے کی خاموش آواز، ناکام آرزوؤں کی ٹیس اور نرم احساس ان کے کلام میں جاری وساری ہے۔ انھوں نے زندگی میں بلند مقام حاصل کرنے کے لئے خواب دیکھنے کو ضروری قرار دیا ہے۔ انسان کی قسمت میں قسام ازل نے ہمت، حوصلہ، جوش اور جنون جیسی کیفیتیں حسب توفیق ودیعت کر دی ہیں۔ لیکن آرزوؤں، تمناؤں، خوابوں کو انسان اپنے علم اور طرز فکر کی بنیاد پر پالتا ہے۔ جاں نثار اختر کے نزدیک ایسی آنکھیں بے وقعت ہیں جن میں کوئی خواب نہ بستہ ہو ؎

ایک بھی خواب نہ ہوں جس میں وہ آنکھیں کیا ہیں

اک نہ اک خواب تو آنکھوں میں بسا ؤ یار و

خوابوں کو آنکھوں میں بسانے کے لئے کہنے کا انداز اصرار کی حد تک ہے۔ یہ اصرار دو وجوہات کی بنا پر بہت مناسب اور برمحل معلوم ہوتا ہے۔ اول یہ کہ خوابوں کے تکمیل کی آرزو ہی ہمارے قوت عمل کو مہمیز کرتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ غموں کے دشت بلا خیز میں خوابوں کا سہارا شجر سایہ دار کا حکم رکھتا ہے۔

صبح کی آس کسی لمحہ جو گھٹ جاتی ہے
زندگی سہم کے خوابوں سے لپٹ جاتی ہے

ہر ایک رات نشہ میں ترے بدن کا خیال
نہ جانے ٹوٹ گئیں کے صراحیاں ہم سے

اب دل کے کہاں گرد وہ مہتاب رہے ہیں
پلکوں پہ سلگتے ہوئے کچھ خواب رہے ہیں

ہائے وہ اک رات، ساحل، راگنی، مہتاب تم
بن گئے میرے لئے کیسا سہانا خواب تم

آئے کیا کیا یاد، نظر جب پڑتی ان دالانوں پر
اس کا کاغذ چپکا دینا گھر کے روشندانوں پر

ان اشعار میں خوابوں کو مختلف معنوں میں برتا گیا ہے۔ یہ اشعار جاں نثار اختر کے داخلی کرب اور حزن و امتناع کی روشن دلیل ہیں۔ اپنے محبوب سے بچھڑ جانے کے بعد اس کی یادیں خیال و خواب بن کر ذہن کے نہاں خانوں میں بس جاتی ہیں۔ جاں نثار اختر نے ان اشعار میں اپنی محبوب شخصیت اور اس کی معصومیت کو بڑی اپنائیت سے یاد کیا ہے۔ ان اشعار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کی کیفیت واضح نہیں ہے۔ ان میں نشاط وخلش کا ایسا ادغام ہے کہ بیک وقت ان سے رنج وراحت کا لطیف احساس ہوتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ ان اشعار میں اگر چہ یہ ظاہر نہیں ہے کہ اشعار کا متکلم محبوب کو دوبارہ حاصل کرنے کا متمنی ہے لیکن اس کی یادیں اور خواب ہی اس بات کا اشاریہ ہیں کہ وہ بازیافت کی خواہش دل میں بسائے ہوئے ہے۔ یہ خواہش قوت عمل کو تحریک تو دیتی ہے لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اپنی قوی تر صورت حال میں یہ آزار دل بن جاتی ہے۔ بقول حافظ شیرازی ؎

دل گفت وصالش بہ دعا باز تواں یافت
عمر یست کہ عمرم ہمہ در کار دعا رفت

یا عرفی کا شعر ملاحظہ ہو ؎

گر کام دل ز گریہ میسر شود ز دوست
صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

جاں نثار اختر چونکہ نئی شعری روایت کی ایک اہم کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس دور کے شعرا کی ایک بڑی خصوصیت بے اطمینانی اور غیر یقینی ان کے حصے میں بھی آئی ہے۔ ان کے یہاں انسان کی اپنی ذات سے غیر یقینی اور بے اعتمادی کا تجزیاتی عمل کارفرما ہے۔ وہ چیزوں کو شک کی نظر سے دیکھنے کے قائل ہیں۔ چنانچہ انھوں نے جہاں خواب دیکھنے کو احسن قرار دیا ہے وہیں خوابوں میں جینے کو تضیع اوقات بتایا ہے۔ ان کے یہاں اس طرح کے اشعار بھی ملتے ہیں جو خوابوں سے بیزاری اور لاتعلقی کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن حق تو یہ ہے انھوں نے خوابوں سے بیزاری کے اظہار میں پایان تمنا کی سمت و رفتار کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ انسان کی روز افزوں خواہشات پر عناں گیری کرتے ہیں۔

اسی سبب سے ہیں شاید عذاب جتنے ہیں
جھٹک کے پھینک دو پلکوں سے خواب جتنے ہیں

آنکھوں میں جو بھر لوگے تو کانٹوں سے چبھیں گے
یہ خواب تو پلکوں پہ سجانے کے لئے ہیں

پتا نہیں کہ مرے بعد ان پہ کیا گذری　　میں چند خواب زمانے میں چھوڑ آیا تھا

جاں نثار اختر کی زندگی میں چند سال ایسے بھی ہیں جب انھوں نے مکمل خاموشی اختیار کر لی تھی۔ ادیبوں نے اور نقادوں نے یہ فرض کر لیا تھا کہ جاں نثار اختر کا فکری سوتہ خشک ہو گیا کچھ لوگوں نے اس توقف کو ان کی تھکن پر محمول کیا۔ لیکن بند آنکھیں ہمیشہ خوابیدگی کی علامت نہیں ہوتیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان آنکھیں بند کر کے غور و فکر کرتا ہے۔ جاں نثار اختر کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ انھوں نے جب اپنی خاموشی توڑی تو ان کی شاعری پہلے سے زیادہ توانا اور زندگی کی حرارت سے بھرپور تھی۔ اس میں انھوں نے زندگی کے کرشمات کو نئے سرے سے دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی اور انسان کے پیکر خاکی کے طلسم کا تجزیہ بھی کیا اور تضادات پر لطف طنز بھی کیا۔

نہ کوئی خواب، نہ کوئی خلش نہ کوئی خمار
یہ آدمی تو ادھورا دکھائی پڑتا ہے

دبا کے آئی ہے سینے میں کون سی آہیں
کچھ آج تر ارنگ سانولا سا لگے ہے مجھے

دوسرے شعر کی غزل کو آل احمد سرور نے نئے شباب کی تابناک کرن سے موسوم کیا ہے۔ اس شعر کو سننے کے بعد لامحالہ ہمارا ذہن میرؔ کے مصرعہ ع 'اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں، آگے درد تھا، یا غالبؔ کے مندرجہ ذیل شعر کی طرف مبذول ہو جاتا ہے۔

آشفتگی نے نقش سویدا کیا درست
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

غالب کے شعر میں دود کے اصطلاحی معنی آہ و فریاد اور ناتمام خواہش کے ہیں۔ انسان کے سینے میں دفن تشنہ کام خوابوں کا درد دل میں داغ پیدا کرتا ہے۔ میر اور غالب نے مسلسل خلش سے سینے میں داغ بننے کی قواعد کو شعر کا قالب عطا کیا ہے۔ یعنی انھوں نے درد کی وجہ سے داغ یا سیاہی کا انکشاف کیا ہے۔ لیکن جاں نثار اختر کے شعر کا متکلم اپنے محبوب کا سیاہی مائل رنگ دیکھ کر انکشاف کرتا ہے کہ اس نے سینے میں ''جہاں سوز، آہیں'' دبا رکھی ہیں۔ سینے کی خلش کی وجہ سے اس کا رنگ سیاہی مائل ہوا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جاں نثار اختر خواب دیکھنے کی طرف مائل تو ہوتے ہیں مگر خوابوں کے طلم اور تشنہ کام تمنا کی خلش سے گھبراتے بھی ہیں۔ ان کا یہ طریقۂ کار ان کی شاعری میں خوابوں کی نئی معنوی جہت کی دریافت میں معاون ہوتا ہے اور وہ ایک ہی موضوع میں طرح طرح کے مضامین پیدا کر لیتے ہیں۔ مضامین و موضوعات میں میں نیرنگی جاں نثار اختر کی شاعری کی ایک بڑی خصوصیت ہے اور ان شاعری کی دلکشی کی ایک بڑی وجہ بھی ☆☆☆

؎ غفلت میں وقت اپنا نہ کھو، ہشیار ہو ہشیار ہو = کب لگ رہے گا خواب میں بیدار ہو بیدار ہو　۲۶۰

سب رس

میں صرف غیر مطبوعہ مضامین اور

تخلیقات شائع ہوتے ہیں۔

مضمون

کاغذ کی دیوار

۷/اگست ۱۹۲۷ء کو حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم انھوں نے حیدرآباد میں حاصل کی۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے بی کام اور ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگری لی۔ بچپن سے لکھنے پڑھنے کی طرف ان کا رجحان تھا۔ لہٰذا وہ آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ ہوگئے۔ آزادی سے قبل کے حیدرآباد میں حکومت آصفیہ (نظام شاہی) تھی۔ اس زمانے میں ریڈیو کا نام ''صدائے دکن'' تھا جو آزادی کے بعد آل انڈیا ریڈیو میں تبدیل ہوگیا۔ ان میں ادبی ذوق بدرجۂ اتم موجود تھا۔ اسی ذوق نے انھیں افسانہ نگاری کی طرف مائل کیا۔ اعلیٰ تعلیم اور ادب سے محبت نے انھیں ریڈیو اور افسانوں کے لیے معیاری مواد فراہم کیا۔ انھوں نے ریڈیو کے لیے ادبی پروگرام، ڈرامے اور ادبی فیچرس لکھے۔ وہ ریڈیو میں بی حیثیت آزاد صداکار، پروڈیوسر اور ادیب وابستہ رہے۔

۱۹۵۲ء سے انھوں نے مستقل طور پر ممبئی میں سکونت اختیار کی۔ فلموں میں لکھنے کا شوق انہیں ممبئی لے کر آیا تھا۔ ان کے والدین انھیں وکالت کے پیشے میں دیکھنا چاہتے تھے لیکن انھیں فلمی دنیا کی کشش نے جکڑ رکھا تھا۔ مشہور فلم ڈائریکٹر سری کیدار شرما کے ساتھ چار سال اسسٹنٹ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور فلم ڈائریکشن کے فنی پہلو سیکھے۔ فلموں میں کام تلاش کرنے کے لیے انھیں اپنی شناخت بنانے کی قطعی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ فلموں سے جو بھی اردو کے ادیب و شاعر وابستہ تھے وہ ان کے نام سے آشنا تھے۔ لہٰذا انھوں نے اپنے فلمی کریئر کا آغاز معروف فلمی رائٹر ابرار علوی کے معاون کے کے طور پر کیا۔ راج کپور کی فلم ''اب دلی دور نہیں'' (۱۹۵۸ء) اور دھنونت شاہ کی ''ہتھکڑی'' (۱۹۵۹ء) کے لیے مکالمے لکھے۔ مدھو بالا پرائیوٹ لمیٹیڈ کی فلم ''سپنوں کا محل'' کے مکالمے بھی انھوں نے لکھے نیز ہدایت کار کے فرائض انجام دیے۔

انھیں اردو کے علاوہ انگریزی زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔ وہ اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی صحافت سے بھی جڑے رہے۔ Indian Languages Newspaper Association کے کئی سال تک سکریٹری رہے۔ فلموں میں ان کا رجحان انھیں بالی ووڈ کے ماحول میں لے آیا تھا۔ زبان و بیان پر اچھی دسترس ہونے کی وجہ سے انھوں نے کئی کتابوں پر تبصرے کیے۔ ان کے تبصرے نپے تلے ہوتے تھے۔ چونکہ اسکرپٹ رائٹر تھے لہٰذا بے جا اصراف سے بچنا آتا تھا۔

ممبئی جو اردو افسانہ نگاری کا مرکز رہا ہے یہاں اکثر مجالس کا اہتمام کیا جاتا تھا جس میں ممبئی اور بیرون ممبئی سے افسانہ نگار آتے تھے اور اپنا افسانہ پیش کرتے تھے۔ کچھ افسانوں کے تجزیے بھی پیش کیے جاتے تھے۔ محافظ حیدر صاحب کو جب بھی فرصت ملتی وہ ان محفلوں میں بلاتکلف شامل ہوتے رہتے تھے۔ ان کے دوستوں میں عزیز قیسی اور باقر مہدی شامل تھے۔ وہ ممبئی کے افسانہ نگاروں میں ایک معتبر نام کے ساتھ یاد کیے جائیں گے۔ ان کا افسانہ ''کنفیشن'' ماہنامہ شاعر میں چھپا تھا۔ جسے ادبی حلقے میں کافی سراہا گیا۔ ان کا ذوق کتب بینی اور فلم بینی بہت نفیس تھا۔ انہوں نے کئی مقامی اور غیر مقامی سنیما اور ٹی وی کی جانب سے منعقد کیے گئے فلمی مقابلوں میں بی حیثیت مصنف ک فرائض انجام دیے۔ ایچ۔ ایس۔ راول کی فلم ''لیلیٰ مجنوں'' جس کے مکالمے ابرار علوی نے تحریر کیے تھے بطور معاون مکالمہ نگار اس میں محافظ حیدر کا نام بھی

شامل ہے۔ سنجے خان نے جب اپنا تاریخی سیریل ''ٹیپو سلطان کی تلوار'' کا آغاز کیا تو انھیں لکھنے والوں کی ایک ٹیم کی ضرورت پیش آئی۔اس ٹیم میں نوالکھنوی جیسی بڑی شخصیت کے ساتھ ساتھ محافظ حیدر بھی شریک تھے۔وہ اس سیریل کے ساتھ آخر تک جڑے رہے اور زیادہ تر Episode کے مکالمے انھوں نے ہی تحریر کیے۔

بعد ازاں سنجے خان کے بھائی اکبر خان نے جب ''تاج محل'' پر سیریل کی ابتدا کی تو ان کی نظر انتخاب محافظ حیدر پر پڑی۔تاج محل کی اسکرپٹ لکھنے کا سہرا انھیں کے سر ہے۔اس کے علاوہ اسکارافلمز کے ٹی وی سیریل ''انتظار'' (۱۹۸۹ء) اور ''سرکس'' (۱۹۹۰ء) کے لیے منظر نامہ اور مکالمے لکھے۔ درشٹی کون کے دو پہری سیریل ''تانا بانا'' کی پہلی قسط (۱۹۹۰ء) اور سریل ''مولانا ابوالکلام آزاد'' (۱۹۹۰ء) کا منظر نامہ اور مکالمے بھی تحریر کیے۔

علاوہ ازیں انھیں افسانہ نگاری میں بھی کافی شغف تھا۔اردو کے معیاری اور ادبی رسائل میں ان کے افسانے، تبصرے اور مضامین شائع ہوئے تھے۔ان افسانوں کا مجموعہ'' کاغذ کی دیوار'' ۱۹۹۳ء میں منظر عام پر آیا جس میں تیرہ افسانے شامل تھے۔ انھوں نے ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت تینوں ادوار دیکھے تھے۔وہ علامت نگاری، تجریدیت اور خالص بیانیہ طرز سے بھی واقف تھے۔ان کے اس افسانوی مجموعے کے افسانوں میں تمام مروجہ اسالیب کی جھلکیاں مل جاتی ہیں۔

وہ انور قمر کے والد کے قریبی دوست تھے۔انھوں نے مجرد زندگی گزاری۔شادی کے معاملے میں جب انھیں انور قمر نے پوچھا تو محافظ حیدر کا جواب تھا کہ ان کے ہاتھوں میں شادی کی لکیر ہی نہیں۔ایک روایت پسند قدیم اور مذہبی خیالات رکھنے والے خاندان کے فرد تھے۔حیدرآباد سے ممبئی یہ کہہ کر چلے تھے کہ ممبئی جا کر وکالت کریں گے۔مگر ممبئی آنے کے بعد وہ فلم نگری کی چکا چوند سے خود کو بچا نہیں پائے۔لہٰذا ان کے والدین ان سے سخت ناراض تھے۔حیدرآباد میں ان کا بڑا تاریخی مکان تھا لیکن وہ وہاں واپس نہیں جانا چاہتے تھے۔فلم انڈسٹری کی مشہور ایکٹریس مدھو بالا ان کے ساتھ شادی کی خواہش مند تھیں مگر اس سلسلے میں انھوں نے انور قمر سے ایک گفتگو کے دوران بتایا جسے انور قمر نے اپنے مضمون'' محافظ حیدر ایک افسانوی شخصیت'' میں اس طرح قلم بند کیا ہے۔

> '' میں ایک روایت پسند قدیم اور مذہبی خیالات رکھنے والے کنبے کا فرد ہوں۔گھر سے چلا تھا تو یہ کہہ کر ممبئی پہنچ کر وکالت کروں گا مگر یہاں پہنچ کر فلمی دنیا میں قدم رکھ چکا ہوں۔والدین میرے طرز عمل سے سخت ناراض ہیں۔آپ ہی بتائیں کہ جب انھیں معلوم ہوگا کہ میں نے ایک فلمی ہیروئین سے شادی کر لی ہے تو انھیں جتنا صدمہ ہوگا اس کا آپ اندازہ نہیں لگا سکتے۔جب مدھو بالا سے شادی نہیں کی تو پھر کسی اور سے شادی کیوں کرتا۔'' (۳)

وہ بہ حیثیت انسان نہایت مخلص، با اخلاق، با مروت اور نرم گفتار تھے۔فلم انڈسٹری سے چالیس پچاس سالوں سے جڑے ہونے کے باوجود کبھی انھوں نے اپنے بڑکپن کا رعب نہیں جھاڑا اور نہ ہی اپنے چھوٹوں کے ساتھ ناروا سلوک برتا۔بہ حیثیت مجموعی وہ ایک غیر متنازعہ شخصیت کے مالک تھے۔ان کے مزاج میں غرور نام کا شائبہ تک موجود نہیں تھا۔فلمی دنیا کے متوالوں کی طرح انھیں نام ونمود کی کوئی خواہش نہ تھی۔یہ ان محدود چند لوگوں میں تھے جن کے خلوص کی مثالیں دنیا دیتی ہے۔۳۱/اگست ۲۰۰۳ء کی شام اس نیک، شریف اور پاک باطن انسان نے دنیا کو الوداعی سلام کیا۔موت کے وقت ان کی عمر ۷۶/برس تھی۔

ان کے افسانوں کا ایک یادگار مجموعہ'' کاغذ کی دیوار''

میں شامل تیرہ افسانوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انور خان کی طرح ''موت'' ان کا بھی محبوب موضوع رہا ہے۔ افسانہ ''کنفیشن'' میں فادر ابیلو کی موت کینسر کے مرض سے ہوتی ہے۔ ''ایک سالگرہ'' کی آنٹی نیند کی گولیاں کھا کر خودکشی کر لیتی ہے۔ ''سائے جو بچھڑ گئے'' میں نواب صاحب کی موت دل کے عارضے کے سبب ہوتی ہے۔ ''بھگوان سمپورنانند'' میں سمپورنانند آخر میں سمادھی لے لیتا ہے۔ ''روح کا جگنو'' بھی قبرستان کے ماحول اور موت کے سائے میں جگنوؤں کے تحیر آمیز بیان کا تذکرہ ہے۔ افسانہ ''ڈوبتے ابھرتے تنکے'' میں بھی ایک بے گناہ شخص کی پھانسی کی سزا کا ذکر ہے اور پھانسی سے قبل اس شخص کی مورفرطِ انبساط سے اس وقت ہوتی ہے جب اسے پتہ چلتا ہے کہ اس کی پھانسی کی سزا ملتوی ہوگئی ہے۔

۱۹۹۳ء میں شائع شدہ ان کا افسانوی مجموعہ ''کاغذ کی دیوار'' ادبی حلقے میں اپنا جائز مقام نہیں بنا سکا۔ انھیں اس بات کا ملال تھا لیکن قارئین سے کوئی شکایت نہ تھی۔ دراصل ان کی دیگر مصروفیات نے انھیں افسانہ نگاری کے میدان میں ادب کے مرکزی دھارے میں شامل ہونے سے روکے رکھا۔ دو تین سال کے وقفے میں ان کا ایک آدھ افسانہ منظر عام پر آتا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت کم لوگوں کے ذہنوں میں ان کے افسانے محفوظ ہیں۔ اس ضمن میں سلام بن رزاق نے اپنے مضمون ''محافظ حیدر اور کاغذ کی دیوار'' میں تحریر کیا ہے وہ لکھتے ہیں۔

> ''ادب کا پیڑ کچھ ایسا ہی ہے اگر وقت پر مناسب کھاد پانی نہ ملے تو وہ پھل دینا بند کر دیتا ہے اور پھر ایک عرصے بعد لوگ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ کبھی اس درخت پر پھل بھی لگا کرتے تھے۔'' (۴)

محافظ حیدر نے پچاس پچپن سالہ ادبی زندگی میں افسانے بہت کم لکھے۔ گو کہ ان کی افسانوی دنیا بہت مختصر ہے لیکن جو بھی لکھا ہے وہ نہایت جامع اور فکر انگیز ہے۔ ان کے یہاں گہرا مشاہدہ، زبان کا برمحل استعمال اور پر زور بیانیہ کے ساتھ ساتھ تجربات کا وسیع میدان تھا۔ زندگی کو جینے، برتنے اور سمجھنے کا ان کا اپنا سلیقہ تھا۔ ان کے پاس کہانی کے لیے ایک وژن موجود تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ دیگر مصروفیات کی وجہ سے وہ ادب کی دنیا سے براہ راست رشتہ استوار نہ رکھ سکے وگرنہ ان کے پاس فکشن کو مالا مال کرنے کے لیے خام مواد کی کوئی کمی نہ تھی۔

ان کے افسانوں میں ''سائے جو بچھڑ گئے'' کا نہ جانے کیوں، ہوائی قلعہ اور ''ڈوبتے ابھرتے تنکے'' میں حقیقت نگاری کا رنگ غالب ہے۔ ''سائے جو بچھڑ گئے'' موضوع کے اعتبار سے زمیندارانہ تہذیب کی شکستگی سے پیدا شدہ معاشرتی تبدیلیوں کا خوبصورت بیانیہ ہے۔ نوابی سلطنت کے خاتمے کے بعد ماحول اور معاشرے میں درآئے تغیر سے نواب صاحب کی احساس حمیت کے انتشار کا غیر معمولی اثر اس کہانی کا مرکز ہے جو ایک مخصوص طبقے کی زبوں حالی کا پر اثر بیان ہے۔ نوابیت کے خاتمے کے ساتھ ناداری اور ضروریات زندگی کی دوڑ کا احساس اس میں پنہاں ہے اور انہی ضروریات کے تئیں کنبے کے افراد میں دلوں کی تقسیم کا منظر اور عفت کی سودے بازی کو ..... کرتی ہے۔ نواب صاحب کا ہارٹ فیل ہونا اسی بات پر دلالت کرتا ہے۔ ''نہ جانے کیوں'' یہ افسانہ ایک طوائف کی زندگی کی وہ تصویر ہے جسے حالات نے خودغرض، مفاد پرست اور پتھر دل بنا دیا ہے اور جو عورت کی بنیادی نسائی صفت سے بھی محروم ہے۔ وہ اپنے کاروبار میں نہایت چست اور چالاک ہے اور اتنی کٹھور بن چکی ہے کہ وہ باطنی طور پر دوست بننے کی صلاحیت سے بھی محروم ہو چکی ہے اور اپنے دھندے کی روزمرہ کی روش نے اسے ہر احساس سے نا آشنا بنا دیا ہے۔

افسانہ ''ہوائی قلعے'' انسانی نفسیات کی مختلف گرہوں

سے ہوتا ہوا انسانی رشتوں کی قلعی کھولتا ہے ۔ بیٹا اپنے والد کے نوکری سے سبکدوش ہونے کے بعد ملنے والی خطیر رقم پر نظر رکھے ہوئے ہے۔اس نے ان ملنے والے روپوں سے کئی توقعات وابستہ رکھی ہیں۔کمپنی کی جانب سے دی گئی ٹکٹ پر اس کے والد جب کشمیر کی سیر کے لیے نکلتے ہیں تو بیٹا اس امید پر ان کا بیمہ کراتا ہے کہ والد کی ناگہانی موت سے اسے ایک لاکھ روپے حاصل ہوجائیں گے اور گھر جا کر وہ موسم کا حال سنتا ہے۔

افسانہ ''ڈوبتے ابھرتے تنکے'' عدلیہ اور قانون کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے۔قانون کے نفاذ اور انصاف پر طنز کرتا ہے جہاں عام آدمی ایک بے بس اور لاچار کی طرح اپنی زندگی کے فیصلے سنتا ہے۔ایک ایسا شخص جسے پھانسی کی سزا سنائی جاتی ہے او رجو اپنی بے گناہی کا ثبوت بھی فراہم نہیں کر پاتا وہ موت اور زندگی کے بیچ جھولتے ہوئے خود سے ہم کلام ہے اور عین پھانسی سے قبل اسے جب اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس کی سزا ملتوی کر دی گئی ہے تو فرطِ خوشی سے اس کا ہارٹ فیل ہوجاتا ہے۔کہانی کے اختتام پر قاری حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔اس کہانی کا انجام ڈرامائی حد تک بے یقینی کی فضا پیدا کرتا ہے۔

ٹائٹل افسانہ'' کاغذ کی دیوار'' بہترین کہانی ہے جو ہمارے ملک اور معاشرے کو دیواروں پر لگے ہوئے ان گنت اور پھٹے پرانے پوسٹرس کے توسط سے پیش کرتا ہے۔اس افسانے میں سماجی، سیاسی صورت حال کا پردہ فاش کیا گیا ہے کہ ہر اخلاقی پامالی کو تکنیک کے بہترین وسیلے سے اس طرح برتا گیا ہے کہ قارئین پر سیاسی حربوں کا پردہ فاش ہوجاتا ہے ۔ دیواروں پر مختلف پوسٹرس ہیں جن میں ایک طرف فلم اسٹار مخصوص برانڈ کی سگریٹ پی رہا ہے اور دھواں اوپر کی جانب رواں ہے ۔ وہیں مسلمانوں کی سیاسی انجمن کا پوسٹر ہے جس میں احمد آباد کے فساد میں بے گھر اور تباہ لوگوں کی بحالی کے لیے چندے کی اپیل ہے۔ایک طرف گئو رکشا سمیتی کا پوسٹر ہے تو وہی دوسری طرف کا پوسٹر قربانی کے جانوروں کی کھال کا عطیہ مانگ رہا ہے۔

افسانہ''کنفیشن''سب سے پہلے شاعر کے شمارے میں چھپا تھا ۔ یہ ان دنوں کی یادگار ہے جب محافظ حیدر ممبئی میں اپنی قسمت آزمارہے تھے ۔ وہ دو دن فاقے سے تھے ۔ان دنوں وہ ماؤنٹ میری چرچ میں جا کر بیٹھ جاتے اور فاقہ بہلا لیا کرتے ۔ روایتی اسلوب میں لکھا ہوا ان کا یہ افسانہ کامیاب ہے ۔اس میں فادر ربیلو اور انورادھا نامی دو کردار کے حوالے سے نفس کی کشمکش اور مذہبی عقائد اور اس کے اصولوں سے مملو ہے ۔عیسائی مذہب میں ایک عام انسان سے فادر بننے تک کے عمل میں جنسی اختلاط کی جبلی خواہشوں کا تزکیہ شامل ہے ۔انورادھا کا جنس کے موضوع پر بے اختیار گفتگو کرنا، فادر ربیلو کو حیران کر دیتا ہے۔فادر جو نہ جانے کتنے لوگوں کے کنفیشن کو سنتا ہے اور لوگوں کے اعتراف گناہ کا امین بن جاتا ہے وہ اپنی جنسی گھٹن کو دبانے کی ناکام کوشش کرتا ہے اور اپنے دل کا بوجھ کسی کے سامنے ہلکا نہیں کر سکتا۔اس کا تزکیۂ نفس ہر دن کینسر کے پھوڑے کی طرح اپنا حجم بڑھاتا رہتا ہے جس سے اس کا جسم ہی نہیں بلکہ اس کی روح بھی بیمار ہوجاتی ہے۔

''ایک سالگرہ'' کامیاب افسانہ ہے جو اعلیٰ طبقے کی خواتین کی زندگی کی کڑوی سچائیوں کا پردہ فاش کرتا ہے اور سماج کے منہ پر طمانچہ رسید کرتا ہے ۔ یہ کہانی ممبئی کے پوش علاقے مالا بار ہلز میں رہنے والے رئیس زادوں کی دنیا کی دلکش تصویر ہے جو''زرنگار'' بنگلے کے احاطے سے ہوتی ہوئی ڈرائنگ رومس اور بیڈ رومس تک پہنچتی ہے ۔اسی سماج کے ایک مخصوص کردار'' آنٹی'' کا خاکہ محافظ حیدر نے بڑے دلنشیں پیرائے میں کھینچا ہے ۔جس کی عمر اکیاون برس ہے اور ہو

خوشبوؤں میں بسی ہوئی ، قیمتی زیورات سے لدی پھندی ، ہندی انگریزی میں کلام کرتی ہوئی اپنی سالگرہ پر آنے والے مہمانوں کا خیر مقدم کر رہی ہے۔ دراصل آنٹی کا کاروبار بردہ فروشی ہے۔ البتہ وہ اس دھندے میں معاشی مجبوریوں کے تحت آنے والی لڑکیوں کو شامل کرتی ہے۔ اسی ضمن میں افسانہ ''ایک سالگرہ'' کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

''آنٹی کئی طریقوں سے اپنا مال دستیاب کرتی تھیں ۔ایک طریقہ تو یہ تھا کہ متوسط طبقے کا روبار کرنے والے دلالوں سے ان کا ربط تھا ۔ یہ دلال ایسی دوشیزاؤں کو آنٹی سے ملا دیتے تھے جو معاشی مجبوریوں کی وجہ سے چوری چھپے پیشہ کرتی تھیں ۔ ان میں کالج کی لڑکیاں بھی تھیں ۔دفتروں میں کام کرنے والیاں بھی اور گھریلو بیویاں بھی ۔ خالص اور اعلانیہ پیشہ ور عورتوں کو ان کے نمایاں گھٹیا پن کی وجہ سے آنٹی نہیں لیتی تھیں سوائے ایسی لڑکیوں کے جو بے حد قبول صورت یا غیر معمولی جنسی کشش رکھنے والی ہوتی تھیں۔'' (۵)

''ایک سالگرہ'' محافظ حیدر کا ایک منفرد افسانہ ہے جس میں اعلیٰ ترین قحبہ خانے کے ماحول کو مکمل جزئیات کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور لڑکیوں کی وصولیابی کے مختلف طریقوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ جسے پڑھ کر قاری حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ انھوں نے آنٹی کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی نشان دہی کی ہے۔ ابتدا میں آنٹی جیسی نائیکہ سے نفرت کا پہلو پیدا ہونا فطری بات ہے ۔ کہانی کے اختتام تک قاری کو آنٹی سے ہمدردی پیدا ہونے لگتی ہے اور جب آنٹی نیند کی گولیاں کھا کر خودکشی کرتی ہے تو قاری کو اس کی موت کا ملال ہوتا ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ محافظ حیدر ممبئی کے اہم اور معتبر افسانہ نگار ہیں ۔ان کے یہاں ترقی پسندی اور جدیدیت کے ساتھ ساتھ مابعد جدیدیت کا رنگ بھی ملتا ہے۔ ان کی کہانیوں میں اقدار کی گراوٹ ، انسانی بے بسی اور زندگی کی بے معنویت کی تصویروں کو بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔

◆◆◆

حواشی :

۱) اعجاز احمد صدیقی ''شاعر'' ص۱۱، ممبئی اکتوبر ۲۰۰۳ء

۲) ایضاً ص۱۴

۳) محافظ حیدر ''مجموعہ کاغذ کی دیوار'' ص۴۰

قلم کاروں سے التماس

☆ برائے کرم مسودہ صاف اور خوش خط لکھیں۔

☆ مقالہ صفحے کی ایک جانب لکھا ہوا ہو۔

☆ سطروں کے درمیان فاصلہ چھوڑیں۔

☆ کمپوز کیے ہوئے مسودہ کا پروف اچھی طرح دیکھ لیں۔

☆ اپنے مضامین اور تخلیقات

"idarasabras@yahoo.in" پر بھیج سکتے ہیں۔

سب رس انٹرنیٹ پر

Sherosokhan.net پر پہلے صفحے پر اوپری جانب انگریزی سرخیوں میں ''برقی کتب'' کے عنوان پر کلک کرنے پر ''سب رس' کے شمارے پڑھے جاسکتے ہیں۔ صفحہ اول پر ہی ایک نشان ''سب رس'' کا ہے اس پر کلک کر کے تازہ شمارہ پڑھا جاسکتا ہے۔

راجکماری اندرا دیوی دھن راج گیر/اشرف رفیع

آپ بیتی

یادیں

نواب میر اصغر حسین سے گفتگو

فرانس اور حیدرآباد کے تعلقات قدیم زمانے سے ہیں۔ یہاں کی اکثر عمارتوں کی تعمیر میں فرانسیسی نقوش آج بھی روشن ہیں۔ ہتھیار، فوجی سامان اور ادبی سرمایہ میں فرانسیسی اثرات سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ دو صدی بلکہ اس سے قبل بھی فرانس سے ہمارے گہرے تعلقات رہے ہیں۔ 1799ء میں ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد ٹیپو کے خاندان اور میسور کے خاندانی لوگ علمی و ادبی اور فنی علوم میں مہارت رکھنے والی کئی شخصیتیں حیدرآباد میں آ کر رچ بس گئیں۔ پرانے حیدرآبادی خاندانوں میں فرانسیسی تعلیم اور تہذیب کا کافی زور تھا۔ برٹش حکومت، انگریزی و انگریزوں کی بڑھتی ہوئی سیاست، اقتدار اور انگریزی تعلیم اور مغربی تہذیب کے بڑھتے ہوئے رجحان کی وجہ سے ہندوستان کی ریاستوں سے خصوصاً حیدرآباد سے امراء اور تعلیم یافتہ خاندانوں کے نوجوان، اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان بھیجے جاتے تھے لیکن فرانس کی طرفداری جو ان کے دل میں تھی سو باقی رہی۔ آج بھی ہماری تاریخی عمارتیں فرنچ اسٹائیل میں بنی ہوئی ہیں یا اس کی جھلک کم از کم نظر آتی ہے۔ Garein de Tassy فرنچ مستشرق 25/جنوری 1794ء تا 9/ستمبر 1878ء اردو اور دکنی کے اولین ماہر لسانیات کی کتابوں خصوصاً خطبات گارساں دتاسی سے ہمارے ملک، ہماری زبان اور تہذیب سے فرانس کی دلچسپی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ گارساں دتاسی کا کتب خانہ جو پیرلیس کے آرکائیوز میں ہے وہ دکنی اور اردو کا بڑا خزانہ ہے۔ حیدرآباد کی علمی ادبی شخصیتیں ماضی بعید و قریب میں اپنے علمی اور تحقیقی مقاصد کے لیے فرانس جایا کرتے تھے۔ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور، پروفیسر مسعود حسن خاں، سر محمد اقبال، پروفیسر مجیب اور کتنے ہی پیرس کے مشہور زمانہ آرکائیوز سے استفادہ کیا کرتے رہے ہیں۔ فرانس کا خوب صورت شہر پیرس صرف اپنی قدرتی حسن کے لیے ہی مشہور نہیں اپنے علمی ادبی کارناموں اور شخصیتوں کی وجہ سے بھی مشہور ہے ہندوسان کے اکثر راجے وہاں گھر بساتے رہے ہیں جن میں پرنس آف بڑودہ نے پیرس میں ایک بڑا خوب صورت مکان بنایا تھا اسی طرح کپورتلاّ، کنج بہار کی گائتری دیوی، مہاراج آف جئے پور تو وہاں آ کر پولو کھیلتے تھے۔

ہماری خوش نصیبی تھی کہ ہمیں اپنے والد کے ساتھ فرانس جانے کا موقع ملا۔ ان کا تبادلہ ہوا تو 1964ء سے آج تک ہم وہیں رہتے ہیں تعلیم بھی وہیں یونیورسٹی میں ہوئی جس کی وجہ سے ہمیں دنیا بھر کی مشہور علمی ثقافتی فنی سیاسی ادبی شخصیتوں سے ملنے ان کے ساتھ وقت گزارنے کا موقع ملا۔ حیدرآباد اور ہندوستان سے بھی کئی اہم ہستیاں وہاں آتی رہیں اور اب بھی آتی ہیں خاص طور پر ہمارے نانا (آغا حیدر حسن مرحوم) کے اکثر شاگردوں کا ایک سلسلہ وہاں آتا رہا ہے۔ ہمیں یاد ہے پروفیسر حمید اللہ صاحب مشہور زمانہ عالم بے بدل کا کافی وقت ہمارے ساتھ گزرتا تھا وہ Muse Guimet اور Louvre اورینٹل آکائیوز کے مشیر تھے۔ خود بھی وہاں تحقیقی کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ ہمارے نانا سے بعض وقت مینسکر پٹ اور Miniatures کے بارے میں مشورے لیا کرتے تھے۔ اسلامی ادبیات پر مولانا کے کام قابل تعریف ہیں اردو کے شاعر اور ادیب بھی وہاں محفلوں میں شرکت کے لیے آتے تھے۔ پروفیسر حمید اللہ نے ہمیں یاد ہے ہمارے نانا کے یہاں ناخن برابر سائز کا ایک گیتا کا نسخہ تھا جس پر ریسرچ کیا تھا اور وہاں کے اورینٹل آرکائیوز میں لوگوں کو بتایا تو وہ حیران رہ گئے۔ ہمارے نانا کے

یہاں Miniatures کا نادر کلکشن تھا۔Muse Guimet کے کیوریٹر بھی ہمارے نانا کے پاس آتے تھے جو ہندوستان کی پہاڑی اور راجستھانی سے تو واقف تھے لیکن دکنی کو بھی وہ ایک غیر معمولی اسکول سمجھتے تھے مگر دکنی کے بارے میں ان کی معلومات بہت کم تھیں ان کی تھوڑی بہت معلومات گارساں دتاسی کے کتابوں سے حاصل کی تھیں یا دکنی Miniatures سے گولکنڈہ، احمد نگر اور بیجاپور کی تاریخ و تہذیب کا اندازہ انہیں تھا۔ ہمارے نانا کو دکنی زبان وادب سے گہرا شغف تھا۔ ہمیں یاد ہے نانا بتایا کرتے تھے سالار جنگ کے تعاون سے (1889-1949)، 1941ء میں انہوں نے دکنی ادب اور تہذیب پر ایک بڑی نمائش کروائی تھی۔ پیرس کے اسکالر پروفیسر حمید اللہ مرحوم بھی اس میں دلچسپی لینا چاہتے تھے اور ہمارے نانا سے اس کے متعلق انٹرویوز لیتے تھے۔

مشہور مزاح نگار 27/ اپریل 1947ء تا 1883ء مرزا فرحت اللہ بیگ ولد مرزا حشمت اللہ بیگ پیرس آتے تو ہمارے نانا سے دلی کی تاریخ اور تہذیب پر گفتگو کرتے تھے۔ دہلی کی شخصیتوں کے بارے میں، ان کی تاریخِ پیدائش، تاریخ وفات، علمی ادبی کارناموں پر معلومات حاصل کرتے تھے۔ ہمارے نانا کو دہلی منہ زبانی یاد تھی فرحت اللہ بیگ کی کتاب ''دہلی کی آخری شمع'' میں اس کی جھلکیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔ مرزا فرحت اللہ بیگ کو بھی ہمارے نانا کی طرح غدر کے متعلق حالات کا بے حد رنج تھا ہمارے نانا انہیں غدر میں اپنے خاندان پر گزری افتاد کا ذکر کرتے تھے بتاتے تھے کہ اٹھارہ سے زیادہ افراد ہمارے خاندان کے اس قیامت خیز ہنگامے میں مارے گئے۔ خواتین قبرستانوں میں پناہ لیتی تھیں۔ فرحت اللہ بیگ جب فرانس آئے تھے تو ان کی صحت بڑی کمزور چل رہی تھی وہ چل نہیں سکتے تھے۔ نانا کے ساتھ بیٹھتے گفتگو کے دوران کچھ دیر کے لیے لیٹ کر آرام بھی کر لیتے تھے پھر یک دم سے اٹھ کر سوال پوچھنا شروع کر دیتے تھے۔ جب وہ آرام کرنے لیٹ جاتے تھے تو نانا وظیفہ میں رہتے تھے ہاتھ میں تسبیح ہوا کرتی تھی ہمارے نانا کے یہاں تسبیحوں کا بڑا عمدہ کلکشن تھا جو آج بھی محفوظ ہے۔

فیض احمد فیض سے ہمارے نانا کی اکثر چھیڑ چلتی رہتی تھی۔ دونوں کے مزاج میں دلی اور پنجاب کا فرق تھا پھر بھی فیض ان کے ساتھ وقت گزارنا پسند کرتے تھے نانا کی اردو زبان پر فیض فدا تھے ہمارے نانا سے فیض ان کی بیوی کے خاندان کے بارے میں پوچھتے تھے دلی کے بارے میں باتیں کرتے تھے فیض کی شاعری نانا سننا چاہتے تھے۔ اور کہتے تھے پنجابی، اردو کو بہت چاہتے ہیں لیکن اسے غارت بھی کر دیتے ہیں مگر ہاتھ میں قلم لیتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اردو کو آب حیات پلا رہے ہیں فیض خوب ہنستے پھر ایک دو شعر اپنے سناتے پھر نانا سے قصے سنتے تھے۔

ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ پیرس میں ہماری ملاقاتیں ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب میں رچی بسی کئی شخصیتوں سے بھی ہوئیں۔ ان میں ایک عبدالحمید اور ان کے بھائی بھی شامل ہیں حکیم عبدالحمید سے کون واقف نہیں انہوں نے یونانی ادویات کو نئی زندگی دے کر ہمدرد دواخانہ قایم کیا۔ پیرس آئے تو ان دونوں بھائیوں نے ہمارے نانا سے بھی ملاقات کی وہ سوربون کی ایک انٹرنیشنل طبی کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ انہیں طب یونانی پر بات کرنی تھی۔ ہمارے یہاں بھی آئے۔ میں یونیورسٹی سے آیا تو وہ دسترخوان پر بیٹھے ہوئے تھے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہنے لگے وہ نانا کے بچپن کے دوست ہیں۔ ہمارے نانا نے کہا یہ دونوں حکیم ہیں۔ ہمیں عجیب معلوم ہوا کہ یہ دو بیچارے سیدھے سادے ہندوستانی حکیم، شیروانی کھلے پائنچے کے پاجامے کالے جوتے پہنے ہوئے تھے، ہ کیسے پیرس آگئے شاید انہیں انگریزی یا فرنچ بھی نہیں آتی ہوگی! ہم نے حکیم عبدالحمید صاحب سے پوچھا ''آپ کے یہاں مریض آتے ہیں'' مجھے یہ شک تھا کہ اس زمانے میں کیا طب یونانی کی بھی اہمیت ہے؟ انہوں نے بہت

ہی سادگی سے فرمایا ہاں! ہاں میاں اللہ کا شکر ہے چند مریض آجاتے ہیں اور میں ان چند کو دیکھتا ہوں'' پھر میں نے ایک سوال کیا جس پر آج بھی شرمندہ ہوں آپ کے مریض غریب فیس کیا دے سکتے ہوں گے کیا یہ آپ کے رہنے سہنے گزر بسر کے لیے کافی ہوتی ہے۔ ہاں ہاں میاں ہمارے روزگار اور رہن سہن کے لیے کافی ہے۔ اللہ کا شکر ہے!

کھانے کے بعد میں نے انہیں ٹیکسی دلائی، بٹھایا اور اپنی دانست میں یہ سمجھا ان بیچاروں کے پاس اتنا کہاں ہوگا ٹیکسی کا کرایا دینے کے لیے اپنی جیب سے یوروز نکالے اور ٹیکسی کا کرایا ڈرائیور کو دیا۔ وہ دونوں بھائی حیرانی سے میری طرف دیکھنے لگے کہا ''نہیں بیٹے اس کی ضرورت نہیں ہم خود دے لیں گے'' میں نے پھر گستاخی کی ''جی نہیں آپ ہندوستان میں نہیں فرانس میں ہیں اور فرانس بڑا مہنگا ملک ہے اور پھر آپ ہمارے مہمان ہیں'' میں نے کسی اور وجہ سے کرایہ ادا کیا اور انہوں نے شاید اسے ہندوستانی وضع داری سمجھی مجھے پیار کیا اور چلے گئے انہیں وداع کر کے جب میں اوپر آیا اور نانا کو سب کچھ سنایا یہ سمجھ کر کہ نانا بہت خوش ہوں گے۔ انہوں نے ہماری بات سن کر حیرانی کا اظہار کیا اور فرمایا ''تم نے ہماری عزت اتار دی۔ تمہیں معلوم ہے یہ کون ہیں؟'' میں نے کہا دو بیچارے غریب حکیماں ''نانا نے سمجھاتے ہوئے کہا میاں کبھی بھی کسی کے لباس وضع قطع سے نہ سمجھنا کہ ان کی حیثیت کیا ہے۔ تمہیں بتاؤں یہ دو بھائیاں کروڑ پتی ہیں کڑوڑ پتی۔ یہ نہ سمجھنا کہ یونانی حکیم یا ایورویدک کے لوگ غریب ہوتے ہیں ان کی دوائیں نہیں چلتیں۔ وہ مریض کے مرض کو نبض دیکھ کر پہچانتے ہیں مرض کو جڑ سے ختم کرتے ہیں اس لیے ان کے علاج میں اثر دیر سے ہوتا ہے مرض کے اسباب کیا ہیں؟ مریض کی شخصیت کیا ہے؟ کس ماحول میں رہتا ہے؟ تب کہیں جا کر علاج تجویز کرتے ہیں۔ ان کا علاج آج کل کے ڈاکٹروں سے کہیں بہتر ہے۔ ان کی دواؤں میں Side effect نہیں ہوتا۔ انہیں معمولی نہ سمجھو ان کی عزت کرو، احترام کرو اور ہاں جب تم حیدرآباد جاؤ تم حالی کی کتاب ''مقدمہ شعر و شاعری'' ضرور پڑھو تم کو معلوم ہوگا حکیم اور حکمت کیا ہوتی ہے، مجھے اپنے کیے اور کہے پر بڑی شرمندگی ہوئی۔

پرنس معظم جاہ کی شریک حیات شہزادی نیلوفر ہمارے نانا سے اردو سیکھتی تھیں۔ یہ نئی نئی دلہن بن کر حیدرآباد آئی تھیں پیرس میں نانا سے ان کی اکثر ملاقاتیں رہتی تھیں۔ اپنی گفتگو میں وہ حیدرآباد کا اکثر ذکر کرتی تھیں کہتی بھی تھیں مجھے جو محبت حیدرآباد میں ملی اسے نہیں بھول نہیں سکتی۔ وہاں کی خواتین نے بھی مجھ سے بڑی محبت کی۔ ورنہ حیدرآباد کے ماحول میں رہنا میرے لیے بے حد مشکل تھا۔ ہم لوگوں کو ترکی کی عادت تھی۔ نہ مجھے حیدرآباد کی زبان آتی تھی نہ تہذیب جانتی تھی۔ ساری پہننا میں نے وہاں سیکھا۔ مجھے یاد ہے آپ میری ساریوں کی تعریف کرتے تھے اور فرماتے تھے آپ کو رنگ اور کپڑے کی نزاکت کی اچھی پرکھ ہے۔ آپ مجھے حیدرآبادی تہذیب سے واقف کروانے کے لیے قصے سناتے ہیں اس انداز سے سناتے تھے مجھے ہنسی آجاتی تھی۔ آپ ہی نے کہا تھا کہ میں نے حیدرآباد میں ساریوں پر بڑے باڈر ٹانکنے کا فیشن شروع کیا تھا ان کے ڈیزائیوں میں بنجارہ کا بنجاری ٹچ دیا تھا۔ آپ تو جانتے ہی ہوں گے حیدرآباد میں آم کا ڈیزائن عام ہے۔ اور بنجاری میں پتے ہوتے ہیں ابھی بھی میرے پاس وہ ساریاں بارڈر والی رکھی ہوئی ہیں لیکن مجھے یہاں ان کے پہننے کا موقع نہیں ملتا۔ یہ تو شہزادی نیلوفر کی ہنسی خوشی کی باتیں تھیں۔ پیرس میں شہزادی صاحبہ کا شاندار Apartment تھا اس پر ایک بم گرایا گیا عمارت بہت متاثر ہوگئی اللہ کا شکر کہ شہزادی صاحبہ محفوظ رہیں۔ انہیں وہ عمارت چھوڑنی پڑی وہ اس خوب صورت Apartment کے بجائے ایک چھوٹے سے مقام پر آگئیں جہاں انہیں چند مہینے گزارنے پڑے۔

شہزادی صاحبہ سے ہماری والدہ کی اکثر ملاقاتیں رہتی تھیں۔ جب تک ان کا فلیٹ تیار نہیں ہوا تھا والدہ اور نانا شہزادی صاحبہ کی دلجوئی کی باتیں کرتے تھے۔ شہزادی صاحبہ کبھی اپنی ساریاں لاکر ہماری والدہ کو بتاتیں اور فرماتیں اگر آپ کو پسند ہوں تو آپ لے سکتی ہیں۔ والدہ ہمیشہ ان کے ساتھ بڑے احترام سے ملتی تھیں وہ والدہ کو ''بیگم صاحبہ'' بلاتی تھیں۔ والدہ ان سے پوچھتیں آپ مجھے ''بیگم صاحبہ'' کیوں پکارتی ہیں مت پکاریئے ایسا تو وہ فرماتیں میں آپ کے خاندان سے واقف ہوں دیگر یہ کہ میں نے حیدرآبادی تہذیب کو آج تک بھلایا نہیں مجھے اجازت دیجئے کہ آپ کو بیگم صاحبہ ہی پکاروں۔ ہماری والدہ تو پرنسس ہی سے مخاطب کرتی تھیں یا پھر پرنسس نیلوفر۔ حیدرآباد کی یہ تہذیب تھی اس خاص تہذیب کے وسیلے سے دنیا بھر میں حیدرآبادی پہچانے جاتے ہیں ایک دفعہ حیدرآباد کے ریزیڈنٹ Sir Terancecraigcohn کی ملاقات ہمارے والد اور والدہ سے ہوئی والدہ سے انہوں نے پوچھا Are you from Mahboobia School بیگم صاحبہ Hyderabad ہماری والدہ حیران ہوگئیں اور ان کو پوچھا How do you know? ریزیڈنٹ نے جواب دیا

You can always recognised Mahboobia Girls and People of Miss Lynin اس کے بعد چند جملے انہوں نے اردو میں بھی کہے

1960ء میں پیرس کی یونیورسٹی میں گڑبڑ شروع ہوئی اس کی وجہ یہ تھی کہ جو بچے جنگ کے بعد پیدا ہوئے تھے وہ اس عمر کے آگئے تھے کہ یونیورسٹی میں داخلہ لے سکیں لیکن یونیورسٹی میں Seats کی کمی تھی اور اس کا نصاب بھی زمانے کے مطابق نہیں تھا۔ ساتھ ہی ساتھ ملک کے حالات اور زندگی کے تقاضے بھی بدل گئے تھے فرانس کے طلبا یونیورسٹی آف کیلی فورنیا سے جو سیاسی ہوا چل رہی تھی متاثر ہوگئے۔ ریڈرولیوشن اور ریڈ بک کا رواج ہو رہا تھا اس زمانے میں سوربون یونیورسٹی آف Nanterre کے طلبہ بھی مظاہرے کر رہے تھے۔ ان کا مطالبہ تھا اسکالرشپ کا ساتھ ہی نئے پروگرام نئے نصاب اور seats میں اضافے کیے جائیں جس سے فرانس کی حکومت ہل گئی اور دو مہینے تک یہ ہڑتال چلتی رہی تو ملک جیسے ایک جگہ رُک سا گیا تھا۔ ہم والد اور والدہ کے ساتھ حیدرآباد آگئے تو مخدوم محی الدین ہمارے والد سے ملنے گھر آئے۔ ان کے ساتھ چار پانچ کمیونسٹ لیڈر اور بھی تھے ان میں راج بہادر گوڑ اور نرسنگ راؤ کے نام یاد رہ گئے۔ ہمارے والد نے بعنوان Dara ایک طویل نظم لکھی تھی اس کے کچھ بند سنائے والد سے ان کی کتاب مخدوم صاحب نے مانگی ہم سے پوچھا فرانس کے حالات کب بدلیں گے اور کب یہ آزادی کی ہوا یورپ سے ہوکر یہاں پہنچے گی۔ اس کے بعد ہم سے کہا ''سرخ سویرا'' کا فرنچ میں کیا ترجمہ ہوسکتا ہے ہم نے جواب دیا۔ یہ ایک دلچسپ کام ہے ان لوگوں کو بھی اس سے دلچسپی ہوگی۔ کیوں کہ وہاں بھی اب ہندوستان اور چین کی طرف توجہ ہو رہی ہے۔

ہمارے گھر سے انہیں پہچانے ہم ان کے گھر گئے اس وقت وہ ایم ایل اے کوارٹر میں رہتے تھے۔ انہوں نے ہمیں گلے لگا لیا اور کہا ادھر ملیں گے مجھے جواب دینا میری کتاب کے متعلق، مجھے بے حد رنج ہوا اتنے بڑے کمیونسٹ لیڈر، ایسے سادھے سے کوارٹر میں کتنی سادی زندگی گزار رہے ہیں نہ کوئی موٹر نہ بنگلہ نہ کوئی تکلف نہ تصنع سیدھا سادہ انسان اپنی Ideology پر قایم بڑا شاعر بھی ایسے

رعائتی نرخ پر

ادیبوں وشاعروں کی کتابوں کے اشتہارات

''سب رس'' میں شائع کیے جاتے ہیں۔

سعیدہ بانو احمد

خودنوشت

ڈگر سے ہٹ کر

شروع کے تین چار مہینے تو رسم و رسوم اور پارٹیوں میں گزر گئے۔ میری جٹھانی مشفق بھی تھیں، مہربان بھی اور میری دوست بھی۔ انہوں نے میری سسرال کے خرق ماحول کو میرے لیے خوشگوار بنائے رکھنے میں میری بہت مدد کی۔لیکن واقعہ یہ ہے کہ رضا خاندان کے تمام افراد بہت اچھے انسان تھے۔ بے حد وضع دار، اصول پرست، راست گو اور مخلص۔ محمد رضا صاحب کسی ضلع میں سول جج کے عہدے پر مامور تھے لیکن قابلیت اور کھرے انسان ہونے کی دھاک بندھی ہوئی تھی۔انگریز کی دوررس نگاہ نے جانچا، پرکھا اور قدر دانی میں انہیں اودھ چیف کورٹ کی ججی کی پیش کش کی۔ محمد رضا صاحب نے عہدہ تو قبول کرلیا لیکن اپنی بے نیازی قایم رکھی۔ نہ کسی انگریز کے سامنے جھکے، نہ جج کے عہدے کی شکر گزاری میں گورنر بہادر کے دربار میں جبیں سائی کو گئے، نہ کبھی کسی انگریز کے یہاں کھانے کی دعوت قبول کی اور نہ کبھی کسی انگریز کی ضیافت کی۔ کچہری گئے۔ عدالت میں انصاف کا دامن سنبھالے رہے۔گھر آئے اور اپنے نجی مشاغل میں مصروف ہوگئے۔ گنے چنے دوست تھے جو کبھی کبھی آتے جاتے تھے۔ ورنہ سنیاسیوں کی سی زندگی تھی۔ ان کا آرام کا کمرہ اور نشست گاہ الگ تھے۔ اسی میں ایک طرف ایک چھوٹی سی کھانے کی میز بھی لگی ہوئی تھی، ساتھ ہی ایک کمرہ اور تھا جو آفس اور لائبیری کا کام دیتا تھا۔ ان کمروں میں کوئی آزادی سے آجا نہیں سکتا تھا۔صرف ان کی بیگم صاحبہ اور خاص خدمت گار ''انو'' کو یہ شرف حاصل تھا کہ وہ جج صاحب کی خدمت میں حاضر ہوسکیں۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ محمد رضا صاحب کو کوئی تکبر یا گھمنڈ تھا۔ وہ تو بہت منکسر المزاج انسان تھے۔ انسانی ہمدردی اور لوچ ان کی طبیعت میں حد درجہ تھا لیکن سب سے الگ تھلگ رہنا انھوں نے اپنا طریقہ زندگی بنا لیا تھا۔ معلوم نہیں ان کا بچپن کیسا گزرا تھا لیکن اس زمانے کی معاشرت میں بڑوں اور بچوں میں تہذیب وتمیز کی ایک خلیج حائل کردی گئی تھی اور بڑوں نے اپنا رعب و داب قایم رکھنے کے لیے یہ طریقہ اپنا لیا تھا کہ وقت وقت سے لڑکوں بچوں کو اپنے نزدیک آنے دو۔ دور دور سے حکم صادر کرتے رہو کہ یہ ہونا ہے یوں ہونا ہے۔ ایسے بیٹھو ایسے اٹھو۔ یہ پڑھو وہ نہ پڑھو وغیرہ وغیرہ۔ یہ طریقہ شمالی ہند کے صوبہ اودھ میں بہت پایا جاتا تھا۔ محمد رضا صاحب اپنے بیٹوں سے براہ راست کبھی بات نہیں کرتے تھے۔ اپنی بیگم کے ذریعہ گفتگو ہوتی تھی۔ دیکھو سنتی ہو ہاشم کو بلواؤ'' ہاشم چوتھے صاحبزادے کا نام تھا، صاحبزادے حاضر ہوئے۔ سر جھکائے ماں کی آڑ میں آ کھڑے ہوئے۔

''ہوں'' علن کی والدہ ان سے کہو کہ رات کے بارہ بارہ بجے تک پڑھتے نہ رہا کرو۔ آنکھوں پر زور پڑتا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ ان کے کمرے کی روشنی دیر رات گئے تک جلتی رہتی ہے''۔ علن جسٹس رضا کے سب سے بڑے لڑکے کا عرف تھا اور محمد رضا اپنی بیوی کو علن کی والدہ کہہ کر ہی مخاطب کرتے تھے۔ اس زمانے میں شوہر بیوی کو نام لے کر نہیں پکارتا تھا۔ شرم کی بات سمجھی جاتی تھی۔ اب بیگم رضا بیٹے کو مخاطب کر کے کہتیں'' بیٹے دیکھو تمہارے باپ کہتے ہیں کہ رات کو دیر تک نہ جاگا کرو۔ آنکھوں پر زور پڑتا ہے''۔ ہاشم سر تسلیم خم کرتے ہوئے دھیرے سے بولتے جی بہت اچھا۔ ملاقات ختم۔ میاں ہاشم نے اپنے کمرے میں جا کر پناہ لی۔ بچوں کی پرورش میں باپ کی شمولیت بس یہیں تک تھی کہ وہ

بچوں کی صحیح تعلیم اور تربیت پر کڑی نگاہ رکھیں اور تنبیہہ یا اصلاحی احکامات بیوی کے ذریعہ صادر کرتے رہیں۔

میں انہیں ابّا جان کہتی تھی ان کا ناشتہ کھانا وغیرہ سب ان کی نشست گاہ یعنی بیٹھک ہی میں پہنچایا جاتا۔ بیگم رضا اپنے پلو سے مکھی ہلاتی رہتیں اور انو خدمت گار کھانا سامنے رکھتے۔ پلیٹ ہٹانے، میٹھا پیش کرنے، پھل حاضر کرنے کے فرائض ادا کرتے۔ انو سے کسی کا پردہ نہیں تھا۔ جسٹس رضا اور ان کی بیگم دو جوان بیٹیوں کا غم اٹھا چکے تھے۔ ایک کوئی اٹھارہ برس کی تھیں اور دوسری پندرہ سال کی دونوں بچیاں ٹائی فائڈ کے موذی مرض کا شکار ہو گئی تھیں۔ اب ایک بیٹی عقیلہ رہ گئی تھیں۔ بڑی دلاری بیٹی تھیں اور بڑی پیاری شخصیت بھی، یوں بھی محمد رضا صاحب بڑے کنبہ پرور انسان تھے۔ دور چار ضرورت مند بچیوں کے اخراجات اپنے سر لیے رہتے تھے۔ پھر اکلوتی بیٹی کی دلداری کی بھی فکر تھی، بیوی کے لیے بھی گھر میں کچھ چہل پہل ضروری تھی۔ چنانچہ ہر عمر کی بیبیاں گھر میں رسی بسی نظر آتیں۔ جج صاحب کے گھر کے دروازے خاندان کی ضرورت مند عورتوں اور مردوں کے لیے ہمیشہ کھلے رہتے یہ لوگ مہینوں رہتے۔ سر آنکھوں پر رہتے پھر چلے جاتے۔ دوسرے لوگ آجاتے۔ یہ سلسلہ پورے سال قایم رہتا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ علاوہ اس غیر محدود مہمان نوازی کے کوئی آٹھ سو روپیہ ماہوار ضرورت مندوں کے لیے رکھے جاتے۔ اس کی کبھی کسی کو بھنک نہیں ملتی تھی کہ اس میں محمد رضا صاحب کیا خرچ کرتے ہیں۔ بس ایک طریقہ زندگی تھا۔ لڑکوں کے مشاغل میں پڑھنا لکھنا۔ ہاکی ٹینس یا ہفتے میں ایک دو بار سنیما۔ عباس رضا کے دو بڑے بھائیوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ وہ لوگ الگ رہتے تھے تیسرے بیٹے عباس رضا منصفی کے امتحان میں کامیاب ہو کر اپنی تقرری کا انتظار کر رہے تھے۔ ہاشم ICS میں آ گئے تھے اور Probation پر لندن چلے گئے تھے۔ مسعود رضا Imperial Finance کا امتحان دینے کی تیاری کر رہے تھے۔ یہ تھا گھر کا ماحول، جب میں رضا خاندان کی ایک فرد بنی۔

ابن میاں سیدھے سادے انسان تھے ان کے سوچنے کا ڈھنگ بھی بندھے ٹکے رسم و رواج کا پابند تھا۔ غلط میں ہی تھی۔ مگر اس کو کیا کروں کہ اس وقت میں کم عمر تھی اور حکمت عملی کا گر نہیں آتا تھا۔

میری نند برابر اس فکر میں لگی رہتیں کہ میں سب میں گھل مل جاؤں اور میری اجنبیت ختم ہو جائے۔ ایک انوکھی بات یہ ہوئی کہ جسٹس رضا میرے سسر جو نہایت کم آمیز انسان تھے مجھے طلب کرتے۔ اپنے کمرے میں بٹھاتے۔ مختلف موضوعات پر باتیں کرتے اور ایسا ڈھنگ اپناتے کہ جیسے ہم دونوں ایک دوسرے کو بہت دنوں سے جانتے ہیں، ہماری ملاقاتیں بہت طول طویل نہیں ہوتی تھیں لیکن گھر میں میری ساکھ بہت اونچی ہو گئی۔ دھیرے دھیرے ابّا جان کی توجہ اور بڑھی اور جب فرصت ملتی مجھے بلا بھیجتے کتابوں کی باتیں کرتے۔ تاریخ جغرافیہ پر اظہار خیال کرتے۔ ان کی معلومات بہت وسیع تھیں، ہماری گفتگو کافی دل چسپ ہوتی اور میری معلومات میں اضافہ ہوتا۔ باتوں باتوں میں وہ اپنے خاندان کا حال، اپنے رہن سہن کے مخصوص ڈھنگ سے بھی ایسے آگاہ کرتے کہ بس سبیل تذکرہ یہ موضوع آ گیا۔ میں کوئی بہت پڑھی لکھی عورت نہیں تھی مگر ابّا جان کی قدر دانی سے میرا دل بڑھتا، اپنے پر اعتماد بڑھتا اور زندگی خوش گوار معلوم ہوتی۔ ابن بھی زیادہ تر مہربانی سے پیش آتے۔ ابن کی بحیثیت سول جج لکھنؤ ہی میں تقرری ہو گئی۔ وہ ساڑھے نو بجے کچہری چلے جاتے اور پانچ ساڑے پانچ بجے واپس آجاتے۔ چاہے وغیرہ پیتے۔ کچھ کھانے پینے کی چیزیں چائے کے ساتھ ضرور ہوتی تھیں۔ مٹر، پھلکیاں،

پوری کباب،نمک پارے وغیرہ وغیرہ اس قسم کے سارے فرائض میں بخوشی انجام دیتی، زندگی ایک ڈھرے پر آ گئی تھی۔ ہمارے درمیان بے تکلفی اب بھی نہیں تھی۔ باتیں ابن ہی زیادہ کرتے میں سنتی رہتی ۔ نہ کوئی اختلاف رائے ہوتا نہ بدمزگی ۔شرم و لحاظ قاعدے سے اٹھنا بیٹھنا روزمرہ کا ماحول تھا۔میری شوخی وشرارت بے تکی باتیں کر کے ٹھٹھے لگانا،سہیلیوں کا گھل مل کر بے معنی حرکتیں کرنا،سب غائب ہو چکا تھا۔ مجھے اکثر غالب کا یہ شعر یاد آتا رہتا۔

پھر وضع احتیاط سے رکنے لگا ہے دم

عقیلہ کے ساتھ جا بیٹھتی تو تھوڑی دیر کے لیے میرا ہنسنا بولنا واپس آ جاتا۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس زمانے میں مجھ سے کیا شوخیاں سرزد ہوتی تھیں۔لیکن ہونے یہ لگا کہ قریب قریب ہر رات بڑی گرم جوشی اور محبت کا ناطہ قایم ہوتا اور پھر ایک دم نا معلوم وجوہات کے تحت قدرے ناراضگی کا انداز ہو جاتا اور ایکا یکی میری طرف سے پیٹھ کر کے یہ سو جاتے۔مجھ سے نیند کوسوں دور رہتی۔ایسا بھی ہوا کہ اٹھ کر چھت پر چلی گئی وہاں دیوار میں بڑے بڑے طاق سے بنے ہوئے تھے۔میں ساری ساری رات ان طاقوں میں بیٹھ کر یا لیٹ کر گزار دیتی۔

اگر زندگی کی باریکیوں میں نہ جایئے اور یوں رہئے کہ صبح اٹھے منہ ہاتھ دھویا، ناشتہ کیا کچھ دیر ہنسے بولے، کچھ سلائی کی، کوئی سہیلی ملنے آ گئیں، رات کو کہیں دعوت میں ہو آئے، گھر واپس آئے اور سو گئے۔ہاں درمیان میں یہ بھی دیکھ لیا کہ شوہر کے کپڑوں پر استری ہے،کہیں کوئی بٹن تو نہیں ٹوٹا ہے۔ حقہ تازہ کروا دیا۔ جوتوں پر پالش ٹھیک ہے سارے فرائض پورے ہو گئے۔میاں نے کچھ الجھی الجھی باتیں کیں یا مون برت رکھ لیا اور زندگی سلجھی سطح پر آ گئی اس سے زیادہ اور کیا چاہیے۔مشکل تو جب شروع ہوتی ہے جب انسان سیدھے سادے رستے سے اکتا کر اپنی انا کے چکر میں آنے لگتا ہے۔ جا و بے جا توقعات۔ ناز برداری تنک مزاجی سر اٹھاتے ہیں شکایتیں شروع ہوتی ہیں۔حکایتیں بننے لگتی ہیں۔شب کے اختلاط کے بعد یہ الجھ پڑتے پھر چین سے سو جاتے اور میں جاگتی رہتی۔ ایسے میں میری ناپختہ کار عقل مجھے بہت بے چین رکھتی۔ میں ابن کے طریقہ زندگی اور اپنے میکے۔ کے ماحول کا موازنہ کرتی تو سب سے نمایاں فرق یہ نظر آتا کہ عباس رضا کے کوئی مشغلے نہ تھے سوائے کچہری جانے کے اور ضرورت پڑنے پر قانون کی کتابوں کا مطالعہ کر لینا۔ میری سسرال میں سخت پردہ تھا اور میرے کھیل کود ٹینس۔ بیڈمنٹن بھولی بسری باتیں ہو چکی تھیں۔بس کتابیں پڑھتی رہتی تھی۔تھوڑے عرصے بعد یہ محسوس ہونے لگا کہ مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہو رہی ہے۔کیوں کہ ابن یکا یک خاموش ہو جاتے گہری خاموشی۔ جو طویل ہوتی جاتی مجھے چاہے تھا کہ میں اس صورت حال کو مصلحت اندیشی سے ٹالتی رہتی لیکن ہوتا یہ کہ دو تین دن گزرنے کے بعد میری سکت جواب دے دیتی۔اور میں پوچھ اٹھتی کہ آپ کیوں چپ ہیں۔ جواب ملتا،نہیں تو اور ان کی چپ اور گہری ہو جاتی۔

''افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را'' میرا بھی دل ڈوبتا رہتا اور طبیعت کبیدہ خاطر سی رہتی کہ آخر کروں کیا۔ رضا خاندان کے لوگ اس کے عادی تھے کہ ابن خفا ہیں۔ کھنچے کھنچے سے نظر آ رہے ہیں۔سب لوگ خود سناٹے میں آ جاتے اور کسی کی مجال نہ تھی کہ ان کے اس موڈ میں مخل ہو۔ جب جی چاہتا کھانا کھاتے جب جی چاہتا نہ کھاتے۔اب مجھ سے یہ غلطی سرزد ہوئی کہ میں نے ابن سے الجھنا شروع کیا۔آخر یہ کیا ہے،ان سے بحث کرتی انہیں قائل کرنا چاہتی کہ ایسے چپ ہو جانا بہت بری بات ہے۔سارے گھر پر افسردگی چھا جاتی ہے بتا دیجئے اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔ کہہ سن کر بات رفع دفع کیجئے۔کبھی کبھی میں کامیاب بھی ہو

جاتی۔اور یہ پھر خوش خوش نظر آنے لگتے۔لیکن پھر کچھ دنوں بعد یہ خفا ہو جاتے کسی بات پر اور مجھے ہوتا مون برت کا سامنا بہت غور کیا تو ایک دن یہ سمجھ میں آیا کہ انہیں پڑھنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔اب میں ان کے سامنے بہت کم کسی کتاب کو ہاتھ لگاتی۔مگر یقین کے ساتھ مجھے کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ کیا بات ان کی طبیعت کے خلاف پڑ جاتی ہے۔مجھے ان سے محبت تو نہیں ہوئی تھی لیکن میں بے حد فرض شناس تھی۔کبھی ابن صاحب سر دکھنے کی شکایت کرتے تو میں خوشی خوشی ان کا سر دبانے بیٹھ جاتی۔گھنٹوں میں ان کے پیر دباتی رہتی۔یہ اکثر کہتے تھے کہ پیر دکھ رہے ہیں۔میں کبھی روٹھتی نہیں تھی۔گھر کے تمام افراد سے میرے اچھے تعلقات تھے۔میں خوش رہتی تھی۔مشکل ساری یہ تھی کہ یہ مرد تھے اور سیدھے سادے انسان تھے۔انہیں تر کیبوں سے عورت کو رام کرنا نہیں آتا تھا اور میں ایسی سیدھی لڑکی نہیں تھی کہ ایک سیدھے سادے مرد کی قربت پر، واری پیاری ہونے لگتی۔مگر میں ٹیڑھی عورت بھی نہیں تھی۔بس شوخ و شنگ، چلبلی، صاف گو، مخلص اور عجیب معجون مرکب قسم کی لڑکی تھی۔جب ان پر خاموشی کا دورہ نہیں پڑتا تو ہمارے کئی کئی دن اچھے گزر جاتے۔ہنسی خوشی۔

میں پہلے لکھ چکی ہوں کہ میرے والدین بڑے سلجھے ہوئے انسان تھے۔ہمارے پڑھنے لکھنے اور کھیل کود میں گہری دلچسپی لیتے۔باتوں باتوں میں بہت سی جانکاری کی باتیں چھوٹی چھوٹی نصیحتیں تہذیب، تمیز، وقت کی پابندی، صفائی وغیرہ وغیرہ کے اصول ہمارے ذہن نشین کرتے رہتے۔منہ پھلانا، روٹھ جانا، اٹواٹی کھٹواٹی لے کر پلنگ پر پڑا رہنا ایسی باتیں ہم نے گھر میں دیکھی ہی نہیں تھیں۔یہ بھی حکم تھا کہ گھر میں جو کھانا پکا ہے اسے خوشی خوشی کھاؤ۔یہ نخرے نہیں چلیں گے کہ ہمیں یہ نہیں پسند اور وہ نہیں پسند۔دوسرے یہ کہ وقت کی پابندی کے ساتھ کھانا کھاؤ۔یہ نہیں کہ دن بھر منہ چل رہا ہے۔یہ باتیں ہمارے روزمرہ کے رہن سہن کا جز تھیں۔

رضا خاندان بھی متعدد اصولوں کا پابند تھا۔بس ان کا پس منظر دوسرا تھا۔یہاں ان گنت رشتہ داروں سے گھری بیگم محمد رضا۔نہ جانے کتنے رکھ رکھاو سے سب کے ساتھ ناطے بنائے ہوئے۔معمولی پڑھی لکھی خاتون، سب ملا کے چودہ بچے ہوئے جن میں چھ بچوں نے عمر طبعی پائی۔آٹھ بچوں کا صدمہ اٹھا چکی تھیں۔محمد رضا صاحب جج شروع سے ہی اپنا گوشہ عافیت الگ بنا کر قانون کی کتابوں اور کام میں اپنے کو غرق کر چکے تھے۔ایسے میں بچوں کی پرورش بڑی حد تک خود بچوں کی عقل و سمجھ کے مطابق ہوتی رہی۔عباس رضا ان کے تیسرے بیٹے تھے۔بچپن میں بڑی چیچک جسے ''سبتلا'' کہتے ہیں نکل آئی۔اس بیماری سے مشکل سے کوئی بچتا ہے۔خدا کا فضل ہوا کہ یہ بچ گئے۔پھر ٹائی فائڈ ہوا۔اس سے جانبر ہوئے مگر اب صحت کو گھن سا لگ گیا۔نوکری ان کی ان کے چاروں بھائیوں کے مقابلے میں کم تر تھی۔ان کی صوبیائی نوکری تھی۔تین بھائیوں کی Imperial یعنی برطانوی ہندوستان کی نوکری تھی اور ایک بھائی وکیل تھے۔جس گھر میں درجن بھر رشتہ دار عورتیں بر آمدے میں بیٹھی ہیں، کسی کمرے میں باتیں ہو رہی ہیں، چہلیں چل رہی ہیں ''اوئی سنا تم نے ابن بھیا کی بھی نوکری لگ گئی۔'' ہاں مگر کام کیسے کریں گے۔اچھے تو رہتے نہیں ہیں۔سنا ہے ہاشم کی نوکری بہت اونچی ہے۔مسعود بھی لاٹ صاحب کی نوکری میں لے لیے گئے۔کاظم بھیا تو پولیس کے بڑے افسر ہیں۔خیر چلو اچھا ہوا ابن میاں کام سے تو لگ گئے۔ایسے چہ می گوئیاں ہوتی رہیں تو وہاں یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک نو عمر لڑکے پر کچھ اثر نہ ہو۔عباس رضا اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ باتوں اور تعریفوں سے زبردست احساس کمتری میں مبتلا ہو گئے۔اس وقت ان کے والد اور بڑے بھائیوں کا فرض تھا کہ خاندان کی ایسی بے تکی اور نقصان دہ باتوں کو روکتے

اور اپنے بھائی کا بھروسہ بڑھاتے۔ بے پڑھی لکھی عورتیں تھیں ایک دھمکی میں سہم جاتیں۔ ایسے لوگوں میں ان کے خاندان کے متعدد مرد رشتہ دار بھی شامل تھے۔ وہ جائیداد کی دیکھ بھال کے سلسلے میں بیگم رضا کے پاس آتے اور پھر خوشامدانہ لگائی بجھائی کی باتیں کرتے رہتے۔ شروع میں مجھے کوئی اندازہ نہیں ہوا کہ ابن کے مزاج کے اتار چڑھاو کے کیا وجوہات ہو سکتے ہیں۔ جب میں ان کے یہاں پہنچی اس وقت یہ چھ مہینے سے اپنی ماں سے خفا تھے اور ان سے بول چال بند تھی۔ مجھے جب معلوم ہوا تو میں نے عقیلہ کی مدد سے بڑی بڑی ترکیبوں سے میل کروایا۔ مجھے سرکاری نوکریوں کی اونچ نیچ کا نہ علم تھا اور نہ مجھ میں کوئی اس قسم کی ذہنی الجھنیں تھیں جنہیں Complex کہتے ہیں۔ لیکن رضا خاندان میں یہ سب تھا حالانکہ یہ بہت اور اونچے وچاروں کے لوگ تھے۔ میں نے تقریباً ایک سال کے بعد یہ محسوس کیا کہ یہ لوگ نا قابل تلافی حرکتیں کر بیٹھتے ہیں مثلاً میں دوسرا محرم کرنے نیوتنی گئی۔ وہاں رضا خاندان کا آبائی گھر اور امام باڑہ تھا۔ بڑے اہتمام سے محرم منایا جاتا۔ پلاؤ ''شیر مال، خمیری روٹی اور کباب وغیرہ کی مجلسوں کی دھوم تھی۔ عام طور سے بڑے بھائی جان سید آل رضا مجالس پڑھتے اور مراثی سوز خوانی کرتے۔ سارا خاندان اور پورا انیوتنی ان مجلسوں میں دستور ہے کہ پہلا محرم لڑکی میکے میں کرتی ہے۔ اور دوسرا محرم سسرال میں۔ یہ میرا دوسرا محرم تھا اور میں ایک خاص مجلس میں بھائی جان کا مرثیہ سن رہی تھی۔ مرثیہ ختم ہوا بھائی جان نے ذکر کیا کہ ہمیں فخر ہے کہ ہم سرزمین نیونتی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں کی بہت ہی ہستیاں ایسی ہیں جنہوں نے بڑا نام پیدا کیا ہے۔ یہ کہہ کر انہوں نے بہت سے نام گنائے۔ جن میں پورے رضا خاندان کے لڑکوں کا نام لیا۔ کاظم رضا، ہاشم رضا، مسعود رضا لیکن عباس رضا کا نام نہیں لیا۔ کاظم ہاشم و مسعود کی نوکریاں اچھی تھیں باقی ان میں کوئی خصوصیت نہیں تھی۔ بھائی جان نے سارے خاندان اور سارے نیوتنی کے چھوٹے بڑے لوگوں کے سامنے یہ ظاہر کر دیا کہ ابن کی نوکری کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ابن نے اسی وقت مجھ سے کہا کہ چلئے ہم ابھی واپس لکھنو جانا چاہتے ہیں۔ میں نے بڑی مشکل سے سمجھایا کہ سب اسے آپ کی زود حسی پر محمول کریں گے اور سچ پوچھئے تو بھائی جان نے خود اپنی سبکی کی ہے وغیرہ وغیرہ۔ یہ محرم کی نو تاریخ تھی۔ ہم نے دس محرم وہاں گزاری اور ۱۱ محرم کو واپس آ گئے۔ مگر ابن بہت کبیدہ خاطر تھے۔ اس کا علاج یہی تھا کہ جرات کے ساتھ بھائی جان کے گوش گزار کیا جاتا کہ انہوں نے نا قابل تلافی حرکت کی ہے اور آئندہ کے لیے سب کے اوپر یہ اچھی طرح واضح ہو جاتا کہ اس قسم کی باتیں بڑا گہرا دکھ پہنچاتی ہیں۔ دوبارہ ایسی کوئی بات ہرگز نہیں ہونی چاہیے۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہوا اور ابن کے لیے یہ چبھتی ہوئی باتیں گھاؤ بنتی چلی گئیں۔

گرمیاں شروع ہو گئی تھیں۔ یکم جون سے کچہریاں بند ہو جاتی تھیں۔ یہ طے پایا کہ گرمیاں مسوری میں گزاری جائیں۔ میں یہ سن کر بہت خوش ہوئی، میں اپنے والدین کے ساتھ کئی سال مسوری ہی جایا کرتی تھی۔ میں نے خوشی خوشی جانے کی تیاری شروع کر دی۔ مجھے معلوم تھا کہ کیا کیا لے جانا ہے۔ آج کی سی زندگی تھوڑی تھی۔ ٹھہرا ہوا زمانہ تھا۔ دو تین مہینے کے لیے برتن بھانڈے۔ بستر لحاف رضائیاں۔ چینی کے برتن چائے کی پیالیاں۔ چمچے غرض کہ روزمرہ کی ضرورتوں کا سامان بندھ کر جاتا تھا اور کم سے کم تین نوکر ساتھ دیتے تھے۔ پورے موسم کے لیے پانچ چھ بیڈ روم کا گھر سترہ اٹھارہ سو روپے میں مل جاتا تھا۔ اب کے ہم لوگوں نے ایک بیڈ روم کا کاٹیج کرایہ پر لیا۔ اس میں ایک قدرے بڑا کمرہ ایک ڈریسنگ روم ایک غسل خانہ اور ایک برآمدہ شامل تھا۔ کاٹیج کا نام تھا Sedborough Nest۔

میں نے بڑے شوق سے چینی کے برتنوں کو خود پیک کیا اور دوسرے سامان بھی بہت ڈھنگ کے ساتھ صندوقوں میں رکھوائے۔ میرے سسرال والے بڑی تعریفی نظروں سے میرے انتظامات کو دیکھتے رہے۔

۶ رجون کو ہم لوگ مسوری پہنچ گئے۔ میرے ساتھ ایک باورچی اور ایک بوڑھی آیا تھی جو میرے میکے سے میرے ساتھ کر دی گئی تھی۔ یہ کاٹیج مسوری کی ایک بہت مشہور اور مخصوص سڑک Camels Back روڈ پر ایک پر فضا مقام پر واقع تھا۔ سامنے بہت اچھا منظر تھا، میری رومان پسند فطرت کے تمام خوابوں کی تکمیل تھا، میں اپنے ماں باپ کے یہاں آرام سے رہتی آئی تھی۔ جہاں گورو پے پیسے کی فراوانی نہیں تھی لیکن ہمیں کبھی کسی چیز کی کمی بھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ متوسط درجے کی حیثیت تھی اور بھوپال میں رعایا کی ساری توجہ بیگم صاحبہ بھوپال کی طرف مبذول رہتی تھی تو کسی درجے کی اونچ نیچ کا احساس ہم لوگوں کو تو ہوا نہیں۔ یوپی میں بتدریج یہ بات کانوں میں پڑتی رہی کہ اے ''وہ ICS ہیں، وہ ڈپٹی کلکٹر ہیں، فلاں تحصیل دار ہے'' وغیرہ وغیرہ۔ ملنے جلنے میں بھی اس تفریق کا اظہار کسی نہ کسی ڈھنگ سے ہو جاتا تھا۔ Sedborough Nest مجھے بہت اچھا معلوم ہوا اور میں بہت چاو سے اسے سجانے بنانے کے کام میں مصروف ہوگئی۔ گو مجھے اپنے شوہر سے کوئی لگاو پیدا نہیں ہوا تھا اور نہ ان کا برتاو ایسا تھا کہ میرا دل ان کی طرف کھنچتا لیکن اب جب کہ میری شادی ہو چکی تھی اور میں ازدواجی زندگی گزار رہی تھی تو یہ جی چاہنے لگا تھا تاج کہ کوئی شدت سے محبت کرے اور اسی شدت سے میں بھی محبت کر سکوں۔

میں بہت ہی شوخ چلبلی اور خوش رہنے والی عورت تھی۔ زندگی کی چھوٹی موٹی ناخوشگوار باتیں یوں ہی سر سے گزر جاتی تھیں۔ ان کو میں اپنے اوپر چھانے نہیں دیتی تھی۔ چنانچہ اب میں نے اپنی ازدواجی زندگی کی طرف بھی اسی ڈھنگ کو اپنانے کی کوشش کی۔ یہ خیال آیا کہ کون سی مشکل ہے جو سر نہیں کی جا سکتی۔ مجھ میں ہی کوئی خرابی ہوگی کیوں نہ میں اپنے شوہر کے مزاج کو سمجھنے کی کوشش کروں۔ مسوری پہنچ کر یہ خوش نظر آتے تھے۔ ہر وقت گنگنانے رہتے۔ مجھے اچھا معلوم ہوتا۔ سارا لکھنو مسوری پہنچا ہوا تھا۔ جاننے والوں کی کمی نہ تھی۔ دید باز دید کا سلسلہ بن گیا میرے والد کے ایک عزیز دوست رادھا کرشن Sedborough Cottage میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان کی بیوی کو میں رادھا بھابھی کہتی تھی Cottage ہمارے Nest سے کوئی چار قدم پر تھا۔ وہاں بھی آنا جانا رہتا۔ ہمارے یہاں فرنیچر کچھ کم تھا۔ ایک folding قسم کی میز کرائے پر لائے۔ یہ میز تین ٹکڑوں میں تہہ ہو جاتی تھی۔ دوکان دار نے میز کو کھولنے کی ترکیب بتا دی تھی گھر آ کر ہم ترکیب بھول گئے۔ اب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے کھولیں۔

قلیوں کو ہمارے گھر میز لاتے دیکھ کر رادھا بھائی اور بھابھی دونوں ہمارے یہاں پہنچ گئے انہوں نے بھی عقل دوڑائی مگر اتفاقاً ''میز کے نیچے میرا اور آیا کا ایک ساتھ ہاتھ لگا ایک چھوٹے سے لکری کے ٹکڑے پر جسے کھسکایا تو میز کھل گئی۔ لیکن رادھا بھائی اور بھابھی میرا مذاق اڑانے لگے کہ تمہاری آیا زیادہ عقل مند ہے۔ میں ہنستی رہی کہ چلو یوں سہی۔ لیکن ابن بالکل خاموش تھے۔ رادھا بھائی اور بھابھی تھوڑی دیر رک کر گھر چلے گئے اور ابن کی خاموشی گہری ہوگئی اور میز لانے کا میرا جوش و خروش بالکل ٹھنڈا ہو گیا۔ اب میں اس سوچ میں پڑ گئی کہ آخر ہوا کیا؟ ایک لمحہ بھر میں موڈ خراب ہو جانے کی اصل وجہ کیا ہوتی ہے۔ اس وقت تو مجھ میں اتنی سمجھ نہیں تھی کہ میں معاملے کی تہہ کو پہنچ سکتی۔ میرے الھڑ پنے میں مجھ سے نادانستہ طور پر غلط حرکتیں ہو جاتی ہوں گی۔ یہ میری گھٹی میں نہیں تھا کہ میں مرد کو خود سے کم تر سمجھوں یا کسی معاملے میں ان سے اپنی

فوقیت ثابت کروں۔ ابن ایک دو دن کھنچے کھنچے رہے پھر ٹھیک ہو گئے اور زندگی کچھ ڈھب پر آنے لگی۔ میں نے اپنے آپ سے عہد کیا کہ خوش رہوں گی اور خوش رکھوں گی۔ آنا جانا خریداری پکنک، دعوتیں یہ روز کے مشاغل تھے۔ مجھے سان وگمان نہیں تھا کہ مجھ سے کچھ غلطیاں سرزد ہو رہی ہیں۔ ابن دیر میں سو کر اٹھتے تھے میں جلدی اٹھ جاتی تھی۔ صبح کا ناشتہ روز تقریباً دس بجے ہوتا تھا۔ میں صبح اٹھ کر اکثر گھنٹے آدھ گھنٹے کو بھابھی رادھا کے پاس چلی جاتی اور ابن کے بیدار ہونے سے پہلے واپس آ کر ناشتے کے انتظام وغیرہ میں لگ جاتی۔

ایک دن صبح جب میں رادھا بھائی کے یہاں سے واپس آئی تو یہ جاگ رہے تھے۔ بے حد برہمی سے بولے ''آپ رادھا کرشن صاحب کے یہاں گئی تھیں''۔

میں نے کہا ''جی ہاں''

''کیوں گئی تھیں وہاں؟''

''رادھا بھابھی کے پاس گئی تھی''

سچ کیوں نہیں بولتیں آپ'' یہ کیوں نہیں کہتیں کہ رادھا صاحب سے ملنے گئی تھیں''

دیوار کا سہارا لیتی ہوئی میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی کیا کہوں۔ کیا جواب دوں۔ یا خدایا اللہ انہیں معلوم ہے کہ میں رادھا بھائی کے راکھی باندھ چکی ہوں۔ ہر سال نیگ ملتا ہے اور بھابھی رادھا مجھے کس قدر عزیز ہیں، اس سب کے باوجود میرے ڈھنگ ایسے ہیں کہ مجھے اتنا ذلیل اور کمینہ سمجھا جا سکتا ہے۔ ساری دنیا گھوم رہی تھی اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں زمین میں دھنستی چلی جا رہی ہوں۔ لیکن ایسا ہوا نہیں۔ نہ زمین میں دھنسی نہ آسمان پھٹا۔

آیا کی آواز آئی۔ ''ناشتہ لگ گیا ہے بیگم صاحب''

میں نے سوچا کہ ہاں ناشتے کا وقت ہے، دنیا کے معمول میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ چاروں طرف سب کچھ ویسا ہی ہے جیسا چند لمحوں پہلے تھا۔

اٹھو سعیدہ بیگم۔ کندھے سیدھے کرو اور زندگی کی ڈور سنبھالو۔ ناشتہ میز پر ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ میں میز پر آ کے بیٹھ گئی۔

''صاحب سو رہے ہیں بیگم صاحب کہتے ہیں ہم ناشتہ نہیں کریں گے۔''

میں نے ناشتہ زہر مار کیا۔ آیا نے ناشتہ بڑھا دیا۔ میں برآمدے میں آ کر بیٹھ گئی۔ جی چاہ رہا تھا کہ بھاگوں یہاں سے بھاگ جاؤں۔

☆☆☆

شرح

دیوانِ غالب

شارح

سید محمد ضامن کنتوری

مرتبہ

اشرف رفیع

قیمت: -/1200 روپے

-/800 طلباء ایڈیشن

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

www.ephbooks.com

لکشمی دیوی راج

گذشتہ حیدرآباد

حیدرآباد فرخندہ بنیاد ہمیشہ ہی اپنی نوعیت کا مشہور شہر رہا، سارے ملک میں اس کی گنگا جمنی تہذیب کا بول بالا رہا، مذہب آپسی اٹوٹ رشتوں میں حائل نہیں ہوا، تنگ نظری اور تعصب سے ہم واقف نہیں تھے اور نہ کبھی ہوں گے۔ آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو نے حیدرآباد کو ہندوستان کا دل کہا تھا۔ حیدرآباد جہاں میں نے اور میرے آباواجداد نے جنم لیا، ایک نہایت ہی خوبصورت شہر تھا۔ قطب شاہی دور میں تعمیر کی گئی عمارتیں آج تک اپنی آب وتاب سے کھڑی ہیں۔ آصف جاہی دور میں اس شہر کو بڑے سلیقے وشعور سے بسایا گیا۔ شہر میں بازار الگ تھے اور Residential Areas الگ تھے۔ یہ شہر باغات اور باؤلیوں کا شہر تھا۔ ہزاروں سال قدیم چٹانوں نے اس کی خوبصورتی میں اضافہ کیا اور اسے ایک منفرد Look دیا۔ انھیں باؤلیوں کے آس پاس لوگ آباد ہو جاتے اور ان باؤلیوں کے پانی سے ان کی گزر بسر ہو جاتی۔ آج کل صرف کچی باؤلی کے نام سے لوگ واقف ہیں نام کا مطلب بھی نہیں جانتے۔ بہت کم لوگ دودھ باؤلی، پتلی باؤلی، مگر کی باؤلی کے نام سے واقف ہوں گے۔ ہمارے ایک رشتہ دار راجہ پرمانند داس کی دیوڑھی پتلی باؤلی علاقے میں واقع تھی سو اس نام سے ہم مانوس تھے۔ کہتے ہیں کہ اس پتلی باؤلی کی چاروں طرف پتلیاں ہوا کرتی تھیں اور وہ باولی پتلی باؤلی کہلانے لگی۔

ان سب باؤلیوں کے علاوہ ماہ لقا بائی چندا اور ان کی پروردہ کی باولیاں ابھی موجود ہیں۔ ماہ لقا بائی کی ایک باولی EFLU میں موجود ہے۔ ۱۹۹۷ء میں ہندوستان کا پچاسواں یوم آزادی منایا جا رہا تھا۔ وہاں کے V.C. جناب پرمود تالیگری صاحب نے اسی باولی کی صفائی کروائی اور وہاں شریمتی مانیسی راجور کر کا پروگرام منعقد کیا۔ مانیسی جی اس ملک کی مشہور آرٹسٹ ہیں۔ موسیقی کی اس محفل کی کامیابی اور باولی میں اس کی پیش کش پر میں نے انھیں مبارک باد دی۔ پھر ان کی اجازت سے پنڈت جسراج کا 3 دن کا Festival وہاں منعقد کیا۔ اتنے لوگ آتے رہے اور جگہ کی تنگی کا احساس ہونے لگا میں نے V.C. صاحب سے درخواست کی کہ باولی کے اوپر باولی کے اطراف کرسیاں لگوائیں۔

باولیوں کے علاوہ یہاں تالاب بھی تھے جن میں کچھ بچے ہوئے ہیں باقی تو Builders نے ان کو ہضم کر لیا۔ حسین ساگر کو لیجئے جس میں Industrial Waste گنیش کی مورتیاں جو پلاسٹر سی بنی اور زہریلے رنگوں سی سجائی گئی ہوں، Batkamma کے پلاسٹک کے پھولوں سے لاد کر تباہ کر دیا ہے۔ خدا معلوم ہم حسین ساگر کو پھر کبھی اسی اصلی حالت میں دیکھ پائیں گے؟

تالاب درگ کو لیجئے جس سے گولکنڈے کو پانی سربراہ کیا جاتا تھا اب اس دردناک حالات میں ہیں Private Parties & Function کو دیا جاتا ہے اور تالاب کچرے اور Plastic Bags سے لبریز ہے۔ عثمان ساگر میں دو سال قبل مویشی گھوم رہے تھے، پانی کا قطرہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ دل بے چین ہو جاتا ہے، تڑپ جاتا ہے اے شہر تیری دردناک حالت دیکھ کر، آندھرا پردیش بنایا گیا تو چٹانوں کو مٹانا شروع ہوا۔ آندھرا سے آئے ہوئے رئیسوں نے اپنے بڑے بڑے گھر انھیں چٹانوں کو توڑ کر استعمال کیا پھر Malls سے لادا گیا۔

1970ء میں ہمارے ایک مہمان احمد آباد سے تشریف

لائے جن کا نام ہرش ودن منگل داس اور جن کے والد کے نام سے منگل داس مارکٹ بنی ممبئی ہیں۔ان کو میں نے اور سرفراز حسین میر معظم حسین کے صاحبزادے نے Jeep میں بٹھا کر Jubilee Hill کی سیر کرائی۔ ابھی تعمیر شروع نہیں ہوئی تھی، نہ سڑکیں بنی تھیں۔ایک جگہ Jeep کھڑا کر کے وہ مسجد دکھائی جہاں اورنگ زیب نماز پڑھا کرتے تھے۔منگل داس صاحب چٹانوں اور اطراف کی خوبصورتی سے اس قدر متاثر ہوئے کہنے لگے اس کو تو Grand Cangon of India کہا جا سکتا ہے۔لوگ ٹوٹ پڑیں گے یہاں آئے اور اس طرح Tourism سے اسٹیٹ کی آمدنی میں اضافہ ہوگا۔مگر اسی طرح Jodhpur سے آیا ہوا ایک 7 سالہ لڑکا اپنی ماں سے بار ہا کہتا رہا کہ ہم ہوائی جہاز سے نہیں لوٹیں گے بلکہ ریل سے جائیں گے۔ ماں نے دریافت کیا تو بچے نے کہا ''ہم یہاں سے پتھر چٹان لے جائیں گے'' جودھ پور ریگستانی علاقہ ہے لہٰذا اس کو یہ پتھر بے حد پسند آئے۔

مانشی ڈے ایک بڑے آرٹسٹ گزرے ہیں جن کی بنائی ہوئی بڑی تصویر SB9 / SBH کی ایک دیوار پر بنی ہے۔ وہ حیدرآباد آکر ان چٹانوں کو پینٹ کیا کرتے تھے۔

نواب مہدی یار جنگ نے بنجارہ ہلز میں اپنا مکان Rock House بنایا اور ساتھ ہی اپنے دوستوں کو اپنے اردگرد کی زمین خریدنے کو کہا۔ جیسے ہی آپ اس گھر میں داخل ہوتے تو داہنی طرف بجائے ایک دیوار کے ایک بڑی چٹان تھی جس نے دیوار کا کام کیا۔ یہ ایک تاریخی مکان ہے جہاں Rabindranath Tagore مہمان رہے اور کویتا لکھی۔ جب نواب صاحب گجرات میں گورنر رہے تو انھوں نے اپنے Greeting Card میں ٹیگور کی کویتا چھپائی تھی۔اس تاریخی عمارت کو ایک لالچی Builder نے بے رحمی سے توڑنا شروع کیا لیکن چند احتجاج کرنے والوں نے اس کو رکوا دیا۔ اس شخص میں ذرا بھی کوئی احساس ہوتا تو وہ اس کو Heritage House قرار دیتا اور بجائے دولت کے عزت کمانے کی کوشش کرتا۔

اب نہ وہ دیوڑھیاں رہیں نہ وہ باغات، اگر ہم اسی طرح اپنے ماضی سے جڑی ہوئی عمارتوں کو توڑتے رہے اور ہم نے ہمارے ماضی سے اس سے جڑی ہوئی کہانیوں کو مٹا دیا تو ہم اپنے ماضی سے علیحدہ ہو جائیں گے۔

اے حیدرآباد میں اگر اپنے آپ کو تجھ پر نچھاور کروں تو بھی تجھے پہلے جیسا شہر بنا نہ سکوں گی۔ دن بدن تباہی مچ رہی ہے جس کی کسر Metro Rail کے کھمبے پوری کر رہے ہیں۔

''کہانی کوئی سناؤ متاشا''

کی غیر معمولی مقبولیت کے بعد

صادقہ نواب سحر

کا

ایک اور ناول

''جس دن سے.....!''

قیمت: -/400 روپے

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس۔دہلی

مشتاق احمد وانی

افسانہ

ریٹ لسٹ

''پتّا پتّا بُوٹا بُوٹا حال ہمارا جانے ہے'' ماسٹر سوم ناتھ کے موبائل فون پہ جونہی یہ مسرور کُن ٹیون ساز و آواز کے ساتھ بج اُٹھی تو انھوں نے فوراً اپنا قیمتی موبائل سیٹ اُٹھایا اور دائیں کان کے قریب لے جا کر پوچھا ''ہیلو۔۔۔کون بول رہے ہیں؟'' آگے سے مردانہ آواز ان کے کان میں پڑی

''میں جناب فرید احمد بول رہا ہوں۔آداب۔یہ میرا دوسرا نمبر ہے جیو۔آپ اسے اپنے موبائل میں سیو کر لیجیے''

''ہاں سنائیے فرید صاحب کیا حال ہے؟ آپ خیریت سے ہیں؟'

''جی خدا کے فضل سے اچھا ہوں'' فرید احمد نے جواب دیا۔

ماسٹر سوم ناتھ نے پوچھا

''اور کہیے میرے لائق کیا خدمت ہے؟''

فرید احمد نے جھٹ سے کہا

''جناب میں نے آپ کی خدمت میں اپنی آزاد نظموں کا مجموعہ'' آوارہ نگاہیں'' رجسٹرڈ ڈاک سے ارسال کیا تھا۔کافی عرصہ ہوا میں چاہتا ہوں آپ اس پہ ایک بصیرت افروز مضمون لکھیں۔ مجھے آپ سے امید ہے کہ آپ یہ کام ہر حال میں کریں گے''

ماسٹر سوم ناتھ نے کہا

''فرید صاحب! آپ کا ارسال کردہ آزاد نظموں کا مجموعہ'' آوارہ نگاہیں'' مجھے موصول ہو چکا ہے لیکن مجھے اسے لفظ لفظ پڑھنا پڑے گا۔اس کے بعد ہی اس پہ کچھ خامہ فرسائی کر پاوں گا۔یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ میں کسی کتاب کا سرنامہ دیکھ کے مضمون نہیں لکھتا''

''جناب آپ کی مہربانی ہوگی'' اس کے ساتھ ہی فرید احمد اور ماسٹر سوم ناتھ کے درمیان سلسلہء گفتگو منقطع ہو گیا۔

ماسٹر سوم ناتھ، گورنمنٹ مڈل اسکول میں مُدرّس ہیں۔ابھی ان کی سروس پندرہ برس باقی ہے۔وہ لکھنے پڑھنے والے ،بڑے دور اندیش،محنتی اور سلجھے ہوئے آدمی ہیں ۔نہایت شریف،ملنسار اور خوش مزاج ہیں۔ان سے بات چیت کر کے ہر کسی کی طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔انھوں نے انگریزی،اردو اور ہندی میں ایم اے کیا ہے۔انگریزی میں ایم اے کرنا انھوں نے اس لیے ضروری سمجھا کہ یہ بین الاقوامی زبان ہے۔اردو ان کی مادری زبان ہے اور ہندی میں ایم اے کرنا اس لئے مناسب سمجھا کہ یہ ہماری راشٹریہ بھاشا ہے۔تینوں زبانوں پہ انھیں خاصا عبور حاصل ہے ۔مترجم بھی ہیں ،مصنف بھی۔زبان کی باریکیوں پہ خاص دھیان دیتے ہیں۔ان کی دھرم پتنی راج رانی، بی ایس سی میڈیکل ہے۔دو بیٹوں اور ایک بیٹی کی ماں ہے۔اپنے بچّوں کا مستقبل روشن بنانے کی فکر میں کوئی بھی ملازمت نہیں کرتی ۔راج رانی، ماسٹر سوم ناتھ کے مقابلے میں کسی حد تک مناسب تیز مزاج ہے۔ان کا بڑا بیٹا نیرج آٹھویں میں پڑھتا ہے۔اس سے چھوٹی بیٹی شاردہ مُنی ہے وہ پانچویں میں پڑھتی ہے اور اس سے چھوٹا دھیرج ہے وہ فسٹ میں پڑھتا ہے۔سوم ناتھ کے دو منزلہ مکان میں تقریباً ساڑھے تین لاکھ سے زیادہ قیمت کی کتابیں ترتیب وار لوہے کے شیلفوں پر رکھی ہوئی ہیں جن میں انگریزی اور ہندی کی کتابیں زیادہ ہیں ۔یہ تمام مختلف موضوعات پہ کتابیں یہ ظاہر کر رہی ہیں کہ ماسٹر سوم ناتھ سہ لسانی علمی و ادبی شخصیت ہیں جنھیں انگریزی اردو اور ہندی ادب سے جنون کی حد تک لگاو ہے۔پڑھتے پڑھتے اور لکھتے لکھتے ان کا دل و دماغ کمپیوٹر صفت ہو گیا ہے۔آدھی آدھی رات تک پڑھتے لکھتے رہتے ہیں ۔وہ سفر میں ہوں یا حضر میں ،خلوت میں یا جلوت میں ہر وقت ان کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی کتاب یا رسالہ ضرور رہتا

ہے۔ پڑھنا لکھنا انھوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا ہے۔ایک روز وہ اسکول سے تھک ہار کے گھر پہنچے تو کھانا کھا کر آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے۔ان کے بچّے لکھنے پڑھنے میں مصروف تھے اور راج رانی رسوئی میں شام کا کھانا تیار کرنے میں لگی ہوئی تھی۔اسی دوران ماسٹر سوم ناتھ کا موبائل فون بج اُٹھا ان کی نیند میں خلل پڑ گیا۔انھوں نے بادل ناخواستہ فون اُٹھایا دیکھا تو سندر لال کا نام موبائل اسکرین پہ نظر آیا۔سندر لال نے کہا

''ماسٹر جی! نمسکار۔۔۔میں سندر لال بول رہا ہوں ۔کیا حال ہے؟''

ماسٹر سوم ناتھ بولے

''ٹھیک ہوں،آپ سنایئے،آپ کا کیا حال ہے؟''

سندر لال نے جواب دیا

''بھگوان کی کرپا سے ٹھیک ہوں'' پھر وہ بولا

''ماسٹر جی! میں نے آپ کے ایڈریس پہ اسپیڈ پوسٹ سے اپنا انگریزی میں ناول''The Black Sun''ارسال کیا تھا۔میرے پاس رسید ہے وہ آپ کو مل چکا ہے۔میں چاہتا ہوں آپ اس کا اردو میں ترجمہ کریں تا کہ زیادہ سے زیادہ ریڈرس تک میرا ناول پہنچ سکے''

''بھائی۔۔۔آپ کا ناول میں نے دیکھ لیا ہے۔تین سو دس صفحات پہ مشتمل ہے، مجھے اسے پڑھنے میں دو ماہ کا وقت درکار ہے۔دیکھیے کیا ہوتا ہے''سوم ناتھ نے یہ کہتے ہی فون کا سوئچ آف کر دیا۔

رات کے دس بجے کے قریب جب وہ کھانا کھانے کے بعد پڑھنے لکھنے بیٹھے تو ان کا موبائل فون بج اُٹھا۔راج رانی اور تینوں بچّے دوسرے کمرے میں سو چکے تھے۔انھوں نے فون اُٹھایا تو دیکھا کہ بغیر نمبر کے کوئی انھیں فون کر رہا ہے۔انھوں نے ہیلو کہا تو آگے سے کوئی نوجوان بولا

''سر میں ماسٹر سوم ناتھ جی سے بات کرنا چاہتا ہوں ۔کیا آپ ہی ماسٹر سوم ناتھ جی ہیں؟''

''ہاں میں ماسٹر سوم ناتھ بول رہا ہوں۔آپ کون ہیں؟''

''سر میرا نام منظور احمد ہے''

''کہیے کیا کہنا چاہتے ہیں آپ؟''

''سر میں ایک ریسرچ اسکالر ہوں ۔اردو میں پی ایچ ڈی کر رہا ہوں۔میرا موضوع ہے''اردو داستانوں میں جنوں اور چڑیلوں کا تذکرہ''میرا یہ موضوع پانچ ابواب پہ مشتمل ہے۔تین باب میں تیار کر چکا ہوں۔دو باب آپ سے لکھوانا چاہتا ہوں۔سر آپ کا جو بھی حکم ہو میں تیار ہوں لیکن میرے یہ دو باب تیار کر دیجیے''

ماسٹر سوم ناتھ ریسرچ اسکالر کی باتیں سن کر دنگ رہ گئے پھر اسے کہنے لگے

''برخوردار!۔۔۔آپ اپنے موضوع کا خاکہ میری ای میل پہ بھیج دیجیے میں دیکھوں گا''انھوں نے اسے اپنا ای میل ایڈریس لکھایا اور فون سوئچ آف کر دیا۔

دوسرے دن جب سوم ناتھ اپنے اسکول میں پانچویں کلاس کے بچّوں کو انگریزی پڑھا رہے تھے تو ان کے بڑے گہرے اور دیرینہ دوست پریم کمار کا فون آیا۔ہیلو کہنے کے فوراً بعد پریم کمار بولے

''میرے جگری دوست!۔۔۔کیا حال ہے تیرا؟''

سوم ناتھ نے بھی دوستانہ انداز میں کہہ دیا

''میرے دوست! میں ابھی تک دنیا میں سانس لے رہا ہوں۔اوپر والے کی مہربانی سے خوش ہوں''

پریم کمار نے پوچھا

''سوم ناتھ!۔۔یار کہاں ہے اس وقت؟''

''میں اس وقت اپنے اسکول میں پانچویں کلاس کے بچّوں کو انگریزی پڑھا رہا ہوں''

پریم کمار نے کہا

''سوم ناتھ! میرے دوست! میں اپنی خودنوشت سوانح عمری ''دل دیا درد لیا'' بذریعہ ڈاک تیرے ایڈریس پہ ارسال کر رہا ہوں۔ اس پہ مجھے تیری جانب سے ایک اچھا سا تنقیدی مضمون چاہیے اور چاہیے بھی دس دن کے اندر''

سوم ناتھ نے کہا

''یار! میں ایک معمولی سا آدمی ہوں۔ میری کیا حیثیت ہے۔ کسی اور سے لکھواتے تو بہتر رہتا''

''نہیں میرے دوست! میری نظر میں اور کوئی نہیں ہے تیرے بغیر، تجھ سے ہی لکھوانا چاہتا ہوں''

''اچھا بھیج دیجیے میں کوشش کروں گا''

پریم کمار نے کہا

''اچھا ٹھیک ہے آج ہی بھیج دیتا ہوں'' یہ کہنے کے فوراً بعد اس نے فون کاٹ دیا۔

ماسٹر سوم ناتھ کے گھر پہ ہر دوسرے تیسرے دن ڈاکیہ کتابیں لے کر آتا۔ بک پوسٹ، اسپیڈ پوسٹ اور رجسٹرڈ ڈاک سے گھر میں بہت سی کتابیں جمع ہوگئی تھیں اور ہر کتاب کے پہلے صفحے پہ ماسٹر سوم ناتھ کو بڑے آداب والقاب کے ساتھ یاد کیا گیا ہوتا۔ کسی نے انھیں ہندی، اردو اور انگریزی کا آفتاب لکھا ہوتا اور کسی نے مہتاب لیکن آخری جملہ اس فرمائش سے تعلق رکھتا کہ زیر نظر کتاب پر آپ ایک عمدہ سا مضمون لکھیے۔ کسی نے سیر حاصل تبصرے کی خواہش کی ہوتی اور کسی نے پوری کتاب کا ترجمہ کرنے کی فرمائش کی ہوتی۔ کتابیں ارسال کرنے والوں کے بار بار فون آتے۔ ماسٹر سوم ناتھ کسی سے نہیں الجھتے۔ جی جی، ہاں ہاں کہتے ہوئے سب کے ساتھ اسی طرح پیش آتے۔ لکھتے لکھتے اور پڑھتے پڑھتے ان کی نظر کمزور ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر نے انھیں موٹے شیشے کی عینک پہنے رکھنے کی ہدایت دی تھی۔

چار دن کے بعد جب ڈاکیہ نے پریم کمار کی ارسال کردہ کتاب ''دل دیا درد لیا'' ماسٹر سوم ناتھ کو پکڑا دی تو وہ اپنے گہرے دوست کی کتاب دیکھ کے بہت خوش ہوئے۔ دونوں کی دوستی لامثال ولازوال معلوم ہو رہی تھی کیونکہ وہ ایک دوسرے کی دانت کاٹی روٹی کھا لیتے تھے۔ ہر روز تین چار بار موبائل فون پہ ان دونوں کے درمیان یارانہ و بے تکلّفانہ گفتگو ہوتی تھی۔ کتاب کا ظاہری حسن خاصا جاذب نظر تھا۔ انھوں نے اپنے گہرے دوست کی کتاب کو اوّلیت دینا حق رفاقت سمجھا۔ یوں بھی پریم کمار ایک اونچے عہدے پہ فائز تھے۔ دوسو بیس صفحات پہ مشتمل پریم کمار کی خودنوشت سوانح عمری ''دل دیا درد لیا'' کو انھوں نے دن رات پڑھنا شروع کیا مگر دوران مطالعہ ماسٹر سوم ناتھ کو اپنے دوست کی کتاب مایوس کرتی چلی گئی۔ املائی غلطیوں کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کی بہت سی غلطیاں یہ ظاہر کر رہی تھیں کہ پریم کمار کو صحیح زبان سیکھنے اور لکھنے کے لیے ایک طویل مدّت درکار ہے۔ انھوں نے پریم کمار کے غلط جملوں کے نیچے لکیریں کھینچنا شروع کر دیں۔ جب کچھ دن کے بعد انھوں نے پوری کتاب پڑھ ڈالی تو اس کے بعد انھوں نے بڑی محنت اور ایمانداری کے ساتھ اس پہ تنقیدی مضمون لکھنا شروع کیا۔ لکھتے لکھتے انھوں نے ایک جگہ پریم کمار کے غلط جملوں کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا

''میرے دوست! اگر آپ بُرا محسوس نہ کریں تو میرا آپ کو یہ مشورہ ہے کہ آپ اردو کی نابغہء روزگار ہستیوں کی تخلیقات ونگارشات کا مطالعہ دھیان وتوجہ سے کیجیے۔ اس سے آپ کو بہت فائدہ ہوگا۔ آپ کی زبان وبیان میں نکھار پیدا ہوگا۔ یہاں آپ ہی کے لکھے ہوئے کچھ غلط جملوں کو درج کر رہا ہوں۔ مثلاً آپ نے لکھا ہے:

''آپ کی خیریت نیک مطلوب چاہتا ہوں۔ کارثواب کا کام۔ اُس کے ذریعے سے۔ پھولوں کا گلدستہ۔ میں عمیق گہرائیوں سے آپ کا مشکور ہوں۔ ماہ صیام کا مہینہ۔ آب زم زم کا پانی۔ آئین کی عصمت

دری۔ حجر اسود کا کالا پتھر۔ خیریت کو خیرت مطلوب ہے۔ میں نے آپ کو لب بام کے کنارے میں دیکھا۔ میں اردو کے لیے سخت مایوس کُن ہوں''

تنقیدی مضمون مکمل ہونے کے بعد جب ماسٹر سوم ناتھ نے اپنے گہرے دوست پریم کمار کے نام و پتے پر مضمون ارسال کر دیا تو سوم ناتھ کو پریم کمار کے فون آنا بند ہو گئے۔ قربتیں دوریوں میں بدل گئیں، پھر جب ایک دن سوم ناتھ اور پریم کمار کی ملاقات شمشان گھاٹ پر ہوئی تو پریم کمار نے سوم ناتھ سے پورا ہاتھ نہیں ملایا صرف تین انگلیاں ملائیں۔ روکھے انداز میں بات کی ۔ ماسٹر سوم ناتھ فوراً سمجھ گئے کہ تنقیدی مضمون میں پریم کمار کی جھوٹی تعریفوں کے پُل نہ باندھنے کا یہ نتیجہ ہے۔ شمشان گھاٹ اور قبرستان میں سنگ دلوں کے دل نرم پڑ جاتے ہیں لیکن پریم کمار کے چہرے سے ناگواری کے آثار عیاں ہو رہے تھے۔

رات کو جونہی ماسٹر سوم ناتھ اپنے بیوی بچّوں کے ساتھ کھانا کھانے لگے تو اسی وقت ان کا فون بج اُٹھا۔ راج رانی نے منع کیا کہ کھانا کھاتے ہوئے فون نہ اٹھائیں لیکن ان سے رہا نہیں گیا فون اُٹھا لیا۔ بغیر نام کے کوئی انھیں فون کر رہا تھا۔ انھوں نے خفگی سے پوچھا

''ہیلو۔۔۔کون؟''

آگے سے نسوانی آواز ان کے کان میں سرایت کر گئی۔ وہ بولی

''جی۔۔۔میں اوشا پوار، ماسٹر سوم ناتھ جی سے بات کرنا چاہتی ہوں ''

''کہیے میڈم کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟ ماسٹر سوم ناتھ بول رہا ہوں''

''سر۔۔! میں ایم فل کی ریسرچ اسکالر ہوں۔ ہندی میں ایم فل کر رہی ہوں۔ میرا ٹاپک ہے ''مدن گوپال کی کویتاؤں کا آلوچناتمک وشلیشن''مدن گوپال پہ آپ نے کافی کچھ لکھا ہے۔ سر! میں چاہتی ہوں آپ میری ہیلپ کریں''

''میڈم۔۔! آپ میری ای میل پہ اپنا ٹاپک بھیج دیجیے میں اسے دیکھوں گا''

ماسٹر سوم ناتھ نے اسے اپنا ای میل ایڈریس لکھایا اور فون کا سوئچ آف کر دیا۔ راج رانی یہ سب دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پہ کُدورت کے آثار ابھر چکے تھے۔ وہ تُرش لہجے میں بولی

''میرا دل چاہتا ہے آپ کا یہ موبائل فون اُٹھا کے کہیں دور پھینک دوں۔ میں آپ کو منع کر رہی تھی کہ کھانا کھاتے ہوئے فون نہ اُٹھائیں لیکن آپ اپنی عادت پہ مجبور ہیں۔ آپ سے رہا نہیں گیا فون اُٹھا ہی لیا۔ کون تھی یہ کنجری؟''

ماسٹر سوم ناتھ نے کچھ بھی نہیں کہا۔ خاموش سر جھکائے کھانا کھاتے رہے۔ دل ہی دل میں سوچنے لگے لوگوں کے مسائل کبھی کبھی میاں بیوی کے سنجوگ کو روگ بنا دیتے ہیں۔

دوسرے دن جب ماسٹر سوم ناتھ اسکول سے گھر پہنچے تو راج رانی آگ بگولہ ہو چکی تھی۔ آتے ہی ان پہ برس پڑی بولی

''آپ کو لکھنے پڑھنے سے فرصت نہیں۔ گھر میں چاروں طرف کتابوں کے انبار دیکھ رہی ہوں۔ اب آپ نے پوجا روم میں بھی کتابیں رکھ دی ہیں۔ اپنے بچّوں کی پڑھائی لکھائی کی آپ کو کوئی فکر نہیں۔ بیٹی کی انگریزی کاپی پہ اس کی اسکول ٹیچر نے یہ شکایت درج کی ہے کہ شاردہ کی لکھاوٹ اچھی نہیں ہے اور نیرج کی کاپی پہ سائنس ٹیچر نے یہ نوٹ لکھا ہے کہ وہ سائنس میں کافی کمزور ہے۔ آپ کو اپنی کتابیں نہیں چھوڑتیں۔ لوگوں کی فرمائشیں پوری کرنے کی آپ کو بہت فکر رہتی ہے لیکن اپنے بچّوں کی پڑھائی کا کیا حال ہے اس کی طرف آپ کا دھیان نہیں جاتا۔ ایک بے فائدہ کام پہ لوگوں نے آپ کو لگا رکھا ہے۔ کیا ملتا ہے آپ کو لوگوں کی فرمائشیں پوری کرنے کے بدلے میں؟ یاد رکھو مجھ سے اب آپ کا یہ سب کچھ برداشت نہیں ہو رہا ہے۔ میں یا تو ان تمام کتابوں کو اٹھا کے گھر کے باہر آگ لگا دوں گی یا پھر ردّی والے کو بلاوں گی''

ماسٹر سوم ناتھ ہکّا بکّا، سہمے ہوئے بلکہ بہت حد تک بیوی کے تُرش لہجے سے مرعوب ہو چکے تھے۔ ہمت جٹاتے ہوئے نرم لہجے میں بولے

''رانی۔۔!اری شانتی رکھو۔سب اچھا ہوجائے گا ۔بھگوان کے لئے میری ان کتابوں کو نہ آگ لگانا اور نہ ردّی والے کو دینا۔میری آتما ان کتابوں میں گھومتی رہتی ہے''

راج رانی اور زیادہ بپھری کہنے لگی

''آپ کی آتما جہاں مرضی وہاں بھٹکے ۔مجھے یہ سب کچھ نہیں چاہیے''

ماسٹر سوم ناتھ نے بڑی عاجزی کہا

''اری کھانا تو کھلا دو، بھوک سے میرا بُرا حال ہو رہا ہے''

راج رانی نے کوئی بھی بات نہیں کی، وہ رسوئی میں گئی اور ڈائنگ ٹیبل پہ کھانا لگا دیا۔

کھانا کھاتے ہوئے انھیں یوں محسوس ہونے لگا کہ جیسے وہ اناج نہیں مٹّی کھا رہے ہوں ۔راج رانی کا تلخ روّیہ انھیں بار بار یاد آ رہا تھا۔پھر جب رات کو بستر پہ گئے تو نیند نہیں آئی ساری رات سوچتے سوچتے بیت گئی۔آخر کار اس نتیجے پر پہنچے کہ راج رانی صحیح کہہ رہی ہے ۔وہ اپنی جگہ بالکل صحیح ہے ۔مطلب پرست ،منافق اور عیّار قسم کے لوگ میرا خون چوس رہے ہیں۔میں لوگوں کی شاعری کی اصلاح کرتا ہوں،ان کی کتابوں پہ مضامین اور تبصرے لکھتا ہوں ،اردو سے ہندی، ہندی سے اردو،اردو سے انگریزی اور انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرتے کرتے تھک چکا ہوں لیکن مجھے کوئی بھی مالی فائدہ حاصل نہیں ہوا۔میں نے اپنی تمام جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کو لوگوں کے لئے وقف کر دیا اور اس کے بدلے میں لوگوں کی ناراضگی مول لی کیونکہ آج کل کے دور میں سچ لکھنا اور سچ بولنا لوگوں کو پسند نہیں ہے۔پھر ان کی سوچ کا دائرہ اور وسیع ہو گیا۔اچانک ان کے دل و دماغ میں نہ جانے یہ خیال کہاں سے آیا کہ جو انھیں بہت زیادہ منافع بخش معلوم ہوا۔وہ سوچنے لگے دکان داروں کے پاس اشیائے خوردنی کے ریٹ مقرر ہیں،سبزی اور پھل فروشوں کے ریٹ مقرر ہیں،سیمنٹ ،بجری اور اینٹ فروخت کرنے والوں کا اپنا ایک ریٹ ہوتا ہے یہاں تک کہ چھوٹی ملازمت سے لے کر بڑی ملازمت تک ریٹ مقرر ہیں ۔نائی اور بُوٹ پالشیے تک کے ریٹ مقرر ہیں لیکن ہائے افسوس! صرف قلمکار کا کوئی بھی ریٹ نہیں !۔۔اس کی کوئی بھی قیمت نہیں ۔۔۔! اس احساس محرومی نے انھیں اس بات پہ آمادہ کیا کہ وہ کل ہی اپنے ادبی کاموں کی ایک ریٹ لسٹ تیار کر کے باضابطہ اخبار میں اشتہار کے طور پر چھپوائیں گے۔

دوسرے دن اسکول جانے سے پہلے ماسٹر سوم ناتھ نے اپنے ادبی کاموں کی ریٹ لسٹ تیار کر دی۔انھوں نے راج رانی کو آواز دی ۔اپنے پاس بُلایا۔وہ روکھے انداز میں آئی ۔اسے کہنے لگے

''رانی۔۔!آج کے بعد تمھیں مجھ سے کوئی بھی شکایت نہیں ہوگی۔یہ دیکھو میں نے اپنے ادبی کاموں کی ریٹ لسٹ تیار کر دی ہے۔اسے پڑھو''

راج رانی نے ریٹ لسٹ پڑھی تو خوش ہوگئی ۔وہ دل ہی دل میں یہ سوچ کے خوش ہو رہی تھی کہ اب ہزاروں روپے گھر میں آنے لگیں گے لیکن جب ماسٹر سوم ناتھ کی ادبی ریٹ لسٹ اخبار میں بطور اشتہار چھپی تو اس کے بعد انھیں نہ کسی نے فون کیا اور نہ ڈاکیے کے ہاتھوں انھیں کسی کی کتاب موصول ہوئی!

☆☆☆

طیبہ خان

افسانہ

بھوک

حق نواز سرو جیسا قد، چوڑا سینہ، بڑی بڑی آنکھیں، مضبوط بازو، لمبا ناک، چوڑی ٹھوڑی، خوبصورت ہاتھ، وہ سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگاتا ہوا بڑی شان سے جیپ سے اُترا، سفید لٹھے کا سوٹ پہنا ہوا اور پاؤں میں کالے رنگ کی پشاوری چپل پہن کر وہ بے حد جاذب نظر لگ رہا تھا۔ جیسے ہی گاڑی ڈیرے سے کچھ فاصلے پر کچی سڑک پر رکی تو وہ بڑی شان سے گاڑی سے اترا۔ گارڈ نے آگے جھک کر دروازہ کھولا۔ دھول اڑاتی ہوئی کچی سڑک پر اس احتیاط سے پاؤں رکھے تاکہ مٹی سے پاؤں گندے نہ ہوں۔

کچی وٹ کے دونوں طرف گنے کی لہلہاتی فصلیں ہوا کے زور سے سنسان دوپہر میں شور کر رہی تھیں۔ پٹھے کترنے والی مشین کی آواز ٹک ٹک بھی آ رہی تھی۔ ٹیوب ویل سے بہتا ہوا ٹھنڈا پانی وٹ کے ساتھ کچے نالے میں بہہ رہا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا ڈیرے تک پہنچ گیا۔ جہاں بڑا سا احاطہ تھا ایک طرف چھپر کے نیچے گائے بھینس جگالی کر رہی تھیں تو دوسری طرف کچھ ملازم حقہ پی رہے تھے۔ شکورن گوبر کے اُپلے بنا کر دیوار پر لگا رہی تھی۔ جیسے ہی وہ اندر داخل ہوا تو جلدی سے اللہ رکھا نے کرسی پیش کی۔

رب نواز نے اِدھر اُدھر گہری نظر ڈالی اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

''اتنے میں اُسے ٹھنڈی لسی کا پیالہ دیا جس میں بالائی پیندوں سے جھانک رہی تھی جیسے کوئی چغل خور چغلی کھانے کے لیے تاک رہا ہو۔ لسی کو دیکھتے ہی رب نواز نے لمبے لمبے گھونٹ بھرنے شروع کر دیے۔''

''واہ اللہ رکھا۔''

''جیسے ہی اندر گئی ٹھنڈ پڑ گئی ہے۔''

جی سرکار!

سرکار! آپ ہی ہمارا سب کچھ ہیں۔ وہ پاؤں دباتے ہوئے کہنے لگا۔

اچھا اچھا!

میں کل شہر جا رہا ہوں۔

ہاں سرکار!

میرے لیے کیا حکم ہے؟

بس جاگتے رہنا کان اور آنکھیں کھول کر رکھنا، سمجھ گئے۔

حجرے میں حاضری کے لیے مرید قطار در قطار کھڑے باری کا انتظار کر رہے تھے کہ کب وہ اندر جا کر حاضری دیں۔ ہر کسی کے ہاتھ میں نیاز کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور تھا۔ کوئی پھولوں کے ہار، کڑھائی کی ہوئی چادریں، اگر بتیاں، چراغوں کے لیے تیل، منت کے دھاگے، کھیر لیے نیچی نگاہوں کیے کھڑے تھے۔ حجرے میں ایک بڑی سی قبر جو اندر سے پکی تھی سفید رنگ کی سرمئی ٹائلیں نفاست سے لگی ہوئی تھیں۔ بڑی بڑی کڑھائی کی ہوئی چادریں جن پر پیلے اور سبز رنگ سے کلمہ لکھا تھا اور ایک بڑا سا جھومر حجرے کے عین وسط میں لگا تھا۔ سرہانے کے ایک طرف چراغ تازہ پھولوں کے گلدستے، گلاب کی نیم مرجھائی ہوئی پتیاں بکھری ہوئی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے آنے والے زائرین کو دیکھ کر سوال کر رہی ہیں کہ مراد تو من کے اندر چھپی ہے یہاں باہر ڈھونڈنے سے کیسے ملے گی۔ اپنے اندر جھانک کر دیکھو وہ مل جائے گا جیسے باہر ڈھونڈ رہے

ہوعقیدت مند احترام سے آنکھیں بند کیے دعاؤں کے لیے ہاتھ بلند کیے رو رہے تھے۔ رب نواز اونچا قد، چوڑا سینہ، پتلی ناک، گہری آنکھیں، دودھیا سفید رنگت، شرم وحیا کی پاسداری لیے گدی پر بیٹھا تھا۔ اسے مریدوں نے شہد کی مکھی کی طرح گھیر رکھا تھا۔

رمضان دائیں طرف بیٹھا سب مریدوں سے نذر نیاز لے کر ایک طرف جمع کر رہا تھا تا کہ دعا کے بعد سب میں تقسیم کر دی جائے۔ روزانہ صبح سے شام تک یونہی زائرین کا رش لگا رہتا اور رب نواز سب کی دادرسی کے لیے کچھ وقت کے لیے حجرے میں آتا تھا۔

زہرا نے جب سے ہوش سنبھالا تھا اُس نے حویلی میں یہی سب کچھ دیکھا تھا۔

بڑی بی بی کی دو ہی بچے تھے ایک زہرا اور دوسرا رب نواز جنھیں بڑے لاڈ سے پال پوس کر جوان کیا تھا۔ جب زہرا نے دسویں جماعت پاس کی تو اس کے بابا جان نے آگے پڑھنے سے منع کر دیا کہ ہمارے ہاں لڑکیوں کو پڑھایا لکھایا نہیں جاتا اس لیے بس اب یہ پڑھائی کے شوق کو ختم کر دے۔ اس پر اس نے کافی شور مچایا مگر کسی پر بھی اس کی بات کا کوئی اثر نہ ہوا۔ سوائے اس کی ماں کے مگر اُن کے ہاتھ میں مجبوری کے علاوہ کچھ بھی تو نہ تھا۔

کتابی چہرہ، جھیل جیسی آنکھیں، نشیلے ہونٹ، لچک دار کمر، نرم وملائم ہاتھ، دھڑکتا سینہ، کمر تک گھنی سیاہ زلفیں، ان سب پر معصوم ادائیں جو دل لبھانے والی تھی۔ معصومیت ایسی جو آنکھوں سے ٹپکتی تھی۔ وہ سرخ کرتے، گولڈن پاجامے، اورنج لپ سٹک لگائے بے حد حسین لگتی تھی۔

وہ اپنی پیشانی پر شفقت بھرے بوسے کے لیے ترستی نگاہیں لیے باپ کو ڈھونڈتی رہتی، مگر اُن کے پاس فرصت ہی کب تھی؟ لالہ رب نواز زیادہ وقت حجرے میں مریدوں کے ساتھ حجرے میں گزار دیتا۔ جب سورج ڈھلنے لگتا، شام کے سائے بڑھنے لگتے، پرندے گھونسلوں کو لوٹتے تو تھکن سے چور مسافر شکن آلود پیشانی لیے گھروں کو لوٹتے تھے مگر زہرا اسی انتظار میں بیٹھی رہتی کہ کس سے دل کا بوجھ ہلکا کرے یہ ساری ٹیسیں اُس کے من میں سوئی کی طرح چبھتی رہتی تھیں اور وہ اس چبھن سے بے حال ہو جاتی۔

اکثر حویلی میں اُس کا دم گھٹتا تو وہ کھلی فضا میں سانس لینے کے لیے باغ میں چلی جاتی۔ خوبصورت ننگے پاؤں گھاس پر یوں چلتی کہ ساری ٹھنڈک اندر تک جذب کر لے اور پھر اپنی مرضی سے جی بھر کر نیلے آسمان تلے سانس لیتی۔

''نوراں جب اُسے یوں دیکھتی تو بول اُٹھتی۔''

''بی بی کیوں کڑھتی رہتی ہو؟''

''یہ تو حویلی کی پرانی روایت ہے کہ عورت کو پیر کی جوتی سمجھتے ہیں۔ نہ وہ اپنی مرضی سے جی سکتی ہے نہ مر سکتی ہے، نہ لکھ سکتی ہے، نہ پڑھ سکتی ہے، نہ ہی ظلم کے خلاف آواز اٹھا سکتی۔ اپنے حق کے چھن جانے پر چپ رہتی، جہاں جی چاہا وہیں بیاہ دیا۔ جتنا چاہا در دیا، جہاں دل کیا رکھ کر بھول گئے۔

''زہرا اُسے حیرت سے تکتی رہ گئی۔'' اتنی گہری باتیں تم نے کہاں سے سیکھی ہیں؟

''اس پر نوراں مسکرائی ہے۔ یہ تو زندگی کے تلخ سبق ہیں جو کتابوں میں نہیں ہوتے۔''

''زہرا ریشمی بالوں کو گالوں سے ہٹاتے ہوئے اداس نگاہوں سے دیکھتی ہوئی طنزاً مسکراتی ہے۔''

ہاں! یہ بات تو ہے۔

وہ اکثر رات کے اندھیرے میں مہمانوں کو حویلی آتے دیکھتی اور ماں سے سوال کرتی کہ

''یہ مہمان رات کے اندھیرے میں ہی کیوں آتے

ہیں؟ اور پھر دن چڑھنے سے پہلے چلے جاتے ہیں۔ دن میں ٹھہرتے کیوں نہیں ہیں۔''

ماں زہرا کے سوال پر تلملا جاتی۔ یہ حویلی والوں کے چونچلے ہیں۔ جن کو پورا کیے بغیر اُن کا جی نہیں بھرتا۔ آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب لیے وہ بات کو ادھورا چھوڑ دیتی ہیں۔

''ماں ان چونچلوں سے چاہے کسی کی روح تک زخمی ہو جائے۔''

''روح کو کون دیکھتا ہے؟''

''بس جسم کی بھوک مٹ جائے۔ ان کے لیے یہی کافی ہے۔''

''یہ بھوک کب مٹے گی؟''

''جب حرام کھانے کی عادت پڑ جائے تو یہ قبر تک ساتھ دیتی ہے۔''

''پھر انسان حلال کم ہی کھاتا ہے۔''

''وہ شکاری کتوں کی طرح جگہ جگہ منہ مارتا پھرتا ہے۔''

''ماں یہ حرام کیوں کھاتے ہیں۔''

آج پہلی بار اُس نے اپنی ماں سے چند سوالات کیے تھے جو کہ ہمیشہ اُسے بے چین کیے رکھتے، وہ جو سوچتی اور محسوس کرتی وہ ایک بہت بڑا سچ تھا، جس سے نظریں نہیں چرائی جا سکتی۔ اسی لیے تو اُس کی معصوم جان اداس رہتی اور ماں یہ کہہ کر بات ٹال دیتی کہ تم ابھی انجان ہو۔ اِن باتوں کی طرف دھیان مت دیا کرو اور وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

اس رات وہ پہلے سے زیادہ افسردہ تھی۔ ذہن میں بہت سے سوالات اُمڈتے اور سوچوں کا ریلا ہلچل مچانے پر تلا تھا۔ وہ تکیے کے ساتھ ٹیک لگائے آنکھیں موندے سوچ کے ویران جنگل میں بھٹکتی رہتی۔ اور وہ یونہی جنگل میں آوارہ چلتی رہتی۔ بے شمار سوالات اس کا پیچھا کرتے رہتے مگر وہ بغیر جواب دیے بغیر خاموش رہتی۔

''اتنے میں نوراں دودھ کا گلاس لے کر کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ لائٹ جلا کر زہرا سے پوچھتی ہے۔''

''خیریت! بی بی جی۔''

''بڑی چپ بیٹھی ہیں۔''

''ہاں! نوراں''

''سب ٹھیک ہے۔''

''لائٹ بند رہنے دو۔''

''کیوں جی!''

''بس اندھیرے من کو بھاتے ہیں۔ تم چلی جاؤ۔''

اتنے میں نوراں بتی بند کر کے چپل گھسیٹتے ہوئے کمرے سے چلی جاتی ہے۔

رات کا ایک بج گیا مگر اس کی نیند اس سے کوسوں دور تھی۔ اِدھر اُدھر کروٹیں بدلتے ہوئے سوچتی کہ بس مرد کو صرف ایک بھوک ہوتی ہے۔

یہ مرد ذات قابلِ اعتبار کیوں نہیں ہوتی۔ کسی ایک کا ہو کر زندگی کیوں نہیں گزارتے۔ شکاری بھیڑوں کی طرح ہر پل شکار ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ دنیا کو دھوکہ دینے کے لیے کبھی کوئی تو کبھی کوئی لبادہ اوڑھ لیتے ہیں، کبھی کوئی خدا کے نام پر گناہ کر کے لذت محسوس کرتے ہیں، کبھی شوہر بن کر بیوی کو بیوقوف بناتے ہیں، کبھی عقیدت کی اندھی پٹی باندھ کر سادہ لوح زائرین کو اُلو بناتے ہیں، کبھی محبت کا لبادہ اوڑھ کر حسن والوں کو لوٹتے ہیں۔ لیکن اندر سے جنسی کتے ہی رہتے ہیں۔ جہاں موقع دیکھا وہی ہاتھ صاف کر لیے۔ ''جہاں دیکھی تھالی پرات وہی گزار دی ساری رات''۔ کبھی

لیڈر بن کر عوام کو لوٹتے ہیں تو کبھی ڈاکٹر بن کر جعلی ادویات مریضوں کو دے کر موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔اس نے پچھلے کئی برس سے اپنی ماں کو جلتے کڑھتے دیکھا تھا۔ان کی آنکھوں میں ہمیشہ ساون برس جانے کے لیے بے تاب رہتا مگر وہ اس کے آگے صبر کے پل باندھتی رہتی۔

یہی سب سوچتے سوچتے نہ جانے کب وہ نیند کی وادی میں کھو گئی۔

حق نواز کے بہترین دوست کم تھے،لیکن اُن میں ایک شاہ میر تھا جو حویلی اور اس میں رہنے والوں سے خوب واقف تھا۔ اکثر حق نواز سے حویلی ملنے آتا تھا۔زہرا اس کے سامنے بہت کم آتی تھی،لیکن پھر بھی اس کی نظر، ہمیشہ اُسے ڈھونڈتی رہتی تھی۔ جب سے زہرا نے جوانی میں قدم رکھا تھا تب سے وہ دن بدن نکھرتی جا رہی تھی۔گول کتابی چہرہ باریک نرم و ملام ہونٹ،جھیل جیسی گہری آنکھیں،گلابی رخسار جن سے اکثر زلفیں ٹکرا جانے کے لیے بے قرار رہتی۔ اِس کی چڑھتی جوانی پر وہ فدا ہونے کے لیے گھات لگائے بیٹھا تھا۔

شاہ میر آج سوچ کر آیا تھا کہ حق نواز سے آج ضرور بات کرے گا کہ زہرا کا ہاتھ اُس کو تھما دے۔شاہ میر چالیس برس کا تھا۔زہرا اٹھارہ برس کی تھی۔ پہلے وہ ہی دو بیویاں برت چکا تھا۔ ایک مر گئی اور دوسری کو طلاق دے دی۔ اب اس معصوم پر نظر جمائے بیٹھا تھا۔شاہ میر کا سانولا رنگ، درمیانہ قد، موٹی موٹی آنکھیں، چوڑا سینہ،تیکھی ناک،موٹے موٹے ہاتھ،چھوٹے پاؤں ،ان سب پر بالوں کو خضاب لگاتا تھا تاکہ عمر چھپ جائے۔شاہ میر نے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد حق نواز سے رشتے کی بات چھیڑ دی۔تو وہ کچھ دیر خاموش رہا چائے کی چسکی لی،آنکھیں جھپکیں اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بات کا جواب دیتے ہوئے کہا''ہاں کہہ دی۔''

''اس کے جواب پر وہ بے ساختہ کھل اٹھا۔''

جب سے زہرا نے یہ خبر سنی تو وہ بے حال ہو گئی تھی۔ اب تو اس کی آنکھوں میں وحشت و حیرت کے سائے نظر آنے لگے۔اُسے زندہ کو قبر میں اتارے جانے کا حکم صادر کر دیا گیا تھا۔ یہ سب سوچ کر اُس کی روح تک کانپ اُٹھتی۔وہ صبح فجر کی نماز کے بعد نوراں کو لے کر باغ میں چلی جاتی۔صبح سویرے پرندوں کی چہچہاہٹ، پھولوں پر شبنم کے قطرے، ہری ہری گھاس پر خوبصورت پاؤں میں پائل پہنے ہولے ہولے چلتی رہتی۔اس کی نرم و ملائم ایڑیاں گھاس کی ننھی ننھی پتیوں سے بھر جاتیں اور نوراں کھڑی مسکراتی رہتی۔وہ تو صبح کی پہلی کرن جیسی اُجلی،ندی کے پانی کی طرف صاف وشفاف تھی۔

''نوراں تو اسے نظر بھر کر دیکھتی بھی نہیں تھی کہ کہیں نظر نہ لگ جائے۔''

بی بی سنا ہے جس بندے کی ہنستے ہوئے آنکھیں بھیگ جائیں تو وہ دل کا سچا ہوتا ہے۔

''نوراں تو بڑی عقل مند ہے۔''وہ پھر سے مسکرانے لگی۔

''بی بی حیاتی نے ایک ہی رات اتنے سبق پڑھا دیے ہیں کہ عقل خود ہی آ گئی۔''

اندھیری رات میں جب چڑھتی جوانی پر کوئی ناگ ڈس لے تو اُس کا زہر سارے بدن میں پھیل جاتا ہے۔جسم پر جگہ جگہ نیلے دھبے،نرم ہونٹوں سے رِستا خون،بکھرے بال،دم توڑتی چیخ وپکار سے ساری حیاتی کے سبق ایک دن ہی آ جاتے ہیں۔''

''زہرا کی ہنسی تھم گئی۔''

''تب درد وجود سے شل ہو جاتا ہے۔''

''کون تھا وہ نوراں؟'' کس نے قیامت ڈھائی؟

''بی بی جو کوئی بھی تھا ہماری فریاد کون سنتا ہے۔''

''بس اب زخم چھپائے زندگی کے دن پورے کر رہی ہوں اور زبردستی ہنسنے لگی۔''

''زہرا ہاتھ کی لکیروں دیکھنے لگی۔ کیا فرق پڑتا ہے؟''

مصور نے جب درد ہی قسمت میں لکھ دیے ہیں۔ اب وہ انھیں جھیلیں یا مر جائیں کیا فرق پڑتا ہے؟ جب آنکھوں پر عقیدت کی اندھی پٹی باندھ دی جائے تو زندہ وجود کو دفن کر دیا جاتا ہے۔ قبروں کے پجاری کیا جانے زندہ رہنے کی خواہش کو کوئی چارہ گری نہیں۔ وہ سسک اُٹھی۔

جب سے شاہ میر کی نظر زہرا پر ٹکی تھی وہ مرجھا سی گئی تھی۔

اب نوراں بھی اداس رہنے لگی۔ شاہ میر کو صبح و شام جھولیاں اٹھا اٹھا کر بددعائیں دیتی تھی مگر وہ بے چاری کر کچھ نہیں سکتی۔ بس تسلی کے چند الفاظ اُس کے پاس تھے جو بی بی کو دیتی رہتی۔ شاہ میر کے نزدیک عورت بچہ پیدا کرنے والی مشین تھی مگر حق نواز کو کون سمجھائے۔

''ماں شاہ میر کو منع کر دیں'' زہرا نے ہمت کر لی۔

''ماں صدقے۔'' کاش یہ اتنا آسان ہوتا۔ وہ سسک اُٹھیں۔

''تمہارا باپ نہیں مانے گا۔''

زہرا کا جواب سن کر حق نواز غصے سے آگ بگولہ ہو گیا

''اُس کی تو عقل پر پردہ پڑ گیا ہے شکر نہیں کرتی کہ ایک پیرزادے کے گھر بیاہی جا رہی ہے۔''

''کچھ خدا کا خوف کرو۔ وہ کلی ہے، مرجھا جائے گی۔''

''اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔'' تمہیں تو صرف بہانہ چاہیے ہوتا ہے بات کو ہوا دینے کا۔

اس کے ساتھ رشتہ جوڑنے کا مطلب تو جانتی ہے کہ وہ پیر کی بیوی بن جائے گی۔

''ساری حیاتی مریدوں کو نوازتے ہوئے گزر جائے گی۔''

''ماں غصے سے کانپ اُٹھی۔''

''اُسے کیوں سولی چڑھانے پر تلے ہوئے ہو۔''

بے اختیار اُن کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔''

''حق نواز پاؤں پٹختا ہوا کمرے سے چلا گیا۔''

پھر زہرا کے آنسو، ساری دعائیں، ماں کی دھمکیاں سب دم توڑ گئیں اور اُسے جیتے جی اندھیری کوٹھڑی میں اتار دیا گیا جہاں وہ سانس تو لے گی مگر مرضی کسی اور کی ہوگی۔

چپ کی بکل اوڑھ کر زہرا کو شاہ میر کے حوالے کر دیا گیا۔

زہرا نے ساری عمر اپنی ماں کو جلتے کڑھتے دیکھا تھا۔ وہ حویلی کے مردوں کے شوق جانتی تھی۔ اب وہی سب اُس کے نصیب میں لکھ دیا گیا تھا۔ حویلی کے مردوں کے لیے عورت پاؤں کی جوتی ہے جب جی چاہا پہن لیا اور جب جی چاہا پھینک دیا۔ جب دل کیا تو ایک جلتی ہوئی چنگاری کی طرح ہوا دے کر سلگتے رہنے کے لیے چھوڑ دیا۔

زہرا کا یہ سب سوچ کر دماغ ماؤف ہونے لگتا تھا۔ اُسے شاہ میر سے شدید نفرت تھی۔ اُس کو دیکھ اُسے ابکائی آتی۔ اور اس کے قریب آنے کے احساس سے اُس کا تن من جل اُٹھتا تھا۔ اُس کا جی چاہتا کہیں دور اُڑ جائے مگر اُس کے بس میں کچھ بھی نہیں تھا۔ دن بھر تو وہ حویلی کے کاموں میں مصروف رہتی مگر ڈھلتا سورج اُسے رشتے کی صلیب پر گاڑ کر خود اندھیروں میں غائب ہو

جاتا۔ زہرا کا تن میں درد نگلتے نگلتے تھک جاتا اور صبح کے ساتھ وہ روح سلوٹیں سمیٹ کر دن کا استقبال کرتی۔

اس رات تیز ہوا کے جھونکے، طوفانی بارش اور بجلی کی گرج سے عجیب شور پیدا ہو رہا تھا۔ کافی رات گزر چکی تھی لیکن شاہ میر ابھی تک واپس نہیں لوٹا تھا کہ اچانک اُسے چیخیں سنائی دی۔ آواز کربناک تھی کہ بارش کے شور بھی تھا۔ زہرا نے کمرے کی بتی جلائی اور باہر نکل گئی۔

وہ آواز کا پیچھا کرتی ہوئی سیڑھیاں اترنا شروع ہوگئی۔ وہاں گھپ اندھیرا تھا۔ بالکل خوف کے مارے پسینے میں شرابور ہوگئی جیسے ہی سیڑھیاں نیچے اتری تو سامنے کی طرف دو کمرے جن کی بتیاں بند تھی اور اس کے ساتھ چھوٹی سی تنگ راہداری تھی اب آواز قدرے مدہم ہوگئی تھی۔ وہ اُس طرف سیدھا چل دی آگے چھوٹا سا کمرہ آیا جس کا دروازہ آدھ کھلا تھا۔ آہستہ سے زہرا نے دروازہ کھولا تو بستر پر پڑی لڑکی کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ جسم پر ناخنوں کے نشان، نیم بے ہوش حالت میں وہ درد سے کراہ رہی تھی۔ لڑکی کا لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا اور شاہ میر اس پر جھکا ہوا تھا۔

زہرا گم صم کھڑی یہ سب قیامت ڈھا دینے والا منظر دیکھ رہی تھی۔ اُس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا اور پاؤں من من کے بھاری ہو چکے تھے۔ ہمت کر کے وہ آگے بڑھی اور بیڈ کے سائیڈ ٹیبل پر پھل کاٹنے والے چاقو کو اٹھایا اور شاہ میر کی کمر میں گھونپ دیا پھر ایک زور کی چیخ بلند ہوئی اور خون کی لہریں پھوٹنے لگیں۔ وہ حواس باختہ اپنے خون آلود ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

بیگ احساس

کا

ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ

افسانوں کا مجموعہ

دَخمہ

قیمت: -/200 روپے

عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی۔ ۹۵

شاعری

غزلیں

مظفرحنفی

الزام کوئی یار طرحدار پر نہیں
مقبولیت غزل کی گلو کار پر نہیں

شہرت کی دھوپ کیسے چڑھی کب اُتر گئی
دھبہ ذرا سا بھی مرے کردار پر نہیں

ہالہ یہ روشنی کا مرے زخمِ سر سے ہے
سہرا کچھ اس کا شملہ و دستار پر نہیں

ہم ایسے وضعدار بھی اس قافلے میں ہیں
جن کو بھروسہ قافلہ سالار پر نہیں

جھلسا دیا مجھے مرے اندر کی آگ نے
تہمت کسی کے سایہ دیوار پر نہیں

ثابت کرے کوئی کہ محبت بھی ہے گناہ
بارِ ثبوت تیرے گنہ گار پر نہیں

سب کو کھٹک رہی ہے مظفر کلاہِ کج
نقاد معترض ترے اشعار پر نہیں

شاعری

غزلیں

مسلم نواز

در و دیوار پر جو آیتیں لکھی ہوئی ہیں
مرے اجداد کی وہ صورتیں لکھی ہوئی ہیں

متاعِ کامیابی کی جبیں پر دیکھ لو تم
ہماری زندگی کی کوششیں لکھی ہوئی ہیں

پڑھو گے دل لگا کر تو سمجھ جاؤ گے خود ہی
کہ کچھ امیدیں اور کچھ خواہشیں لکھی ہوئی ہیں

شعور آجائے گا راہوں میں یونہی چلتے چلتے
کہ راہِ شوق میں کچھ ٹھوکریں لکھی ہوئی ہیں

خوشی کے ساز پر نغمہ سرائی کیا کریں ہم
مقدر میں ہمارے کلفتیں لکھی ہوئی ہیں

ہماری نیکیاں برباد ہو جائیں نہ مسلم
ہمارے نام کچھ بد خصلتیں لکھی ہوئی ہیں

سیفی سرونجی

والی نہیں ہیں شہر کا نہ ہوں وزیر میں
تو بادشاہِ وقت ہے اور ہوں فقیر میں

مجھ کو خریدنے کا ارادہ نہ کیجئے
ہرگز نہ بیچ پاؤں گا اپنا ضمیر میں

مجھ پر یہ کیسا طنز یہ کیسی جلن تری
آیا ہوں بن کے شہر میں تیرا سفیر میں

تھوڑی سی دور چل کے وہ رستے میں تھک گیا
کس کارواں کا اس کو بناؤں امیر میں

یہ بھیڑ میرے آگے لگی ہے تو کس لیے
میں دیوتا نہیں ہوں نہ ہوں کوئی پیر میں

سیفی خدا کا شکر مناؤ کہ اب تمہیں
پہچاننے لگے سبھی برّ صغیر میں

شاعری

غزلیں

مصداق اعظمی

ساری تدبیر مسکراتی ہے
جب یہ تقدیر مسکراتی ہے
دل کے البم میں آج بھی جاناں
تیری تصویر مسکراتی ہے
کچھ تو یہ ہے غزل کے پردے میں
غربتِ میرؔ مسکراتی ہے
اپنے رانجھا پہ کیوں خدا جانے
آج کی ہیر مسکراتی ہے
سرزمین وطن پہ صدیوں سے
میری تعمیر مسکراتی ہے
ہم سے فاقہ کشتوں کے ماضی میں
کوئی جاگیر مسکراتی ہے
سچ کے ہونٹوں پہ زہر کی تیرے
اب بھی تاثیر مسکراتی ہے
پائے عاشقی میں دیکھ کر شاید
خود پہ زنجیر مسکراتی ہے

اسی کوئیں میں سانپ پرانا رہتا تھا
پانی پھر بھی میٹھا میٹھا رہتا تھا
تیری یادوں کے تاروں کو گننے تک
چاند دکھوں کا گھٹتا بڑھتا رہتا تھا
زندہ ہی رہنے کی کوشش میں پہلے
مجھ میں جیسے کوئی مرتا رہتا تھا
اک سنجیدہ سامع میرے اندر بھی
میری غزلیں مجھ سے سنتا رہتا تھا
پہلے انجانے میں دنیا والوں سے
میں بھی اپنے سکھ دکھ کہتا رہتا تھا
آج وہی سورج بن کر اتراتا ہے
میرے قدموں میں جو بیٹھا رہتا تھا
ہمت تھی تو منزل والے رستوں پر
رستہ مجھ کو لیکر چلتا رہتا تھا
میخانے کے شور شرابے میں ساقی
کم سنتا تھا لیکن سنتا رہتا تھا

غزلیں

ہارون شامی

یو تو ہر ایک چیز مری دسترس میں ہے
پر دل نہ دسترس میں کبھی تھا نہ بس میں ہے

دل تو یہ کہہ رہا ہے کہ وہ بے وفا نہیں
لیکن مرا دماغ ابھی پیش و پس میں ہے

اب بھی حضور آپ کو دستار کی پڑی
جو سر کا تاج تھا وہی اب خار وخس میں ہے

دنیا ہے مثلِ منزلِ تکمیلِ آرزو
انجام زندگی کا مگر یک نفس میں ہے

تہمت تراشتے رہیں شیطاں پہ کب تلک
ہر شخص جب کہ قید خود اپنی ہوس میں ہے

شاید انہیں بھی منزل مقصود مل گئی
یارو! پیامِ خیر صدائے جرس میں ہے

بے سمت راستوں کا سفر ہے یہ زندگی
رُک جائے کب کہاں یہ سفر کس کے بس میں ہے

شامی کہاں سے لاؤں میں وہ خوبیِ نظر
وہ خوبیِ نظر جو مرے ہم نفس میں ہے

پر وہی غم وہی آشوبِ جہاں ہے کہ جو تھا
آج بھی سلسلہ آہ وفغاں ہے کہ جو تھا
زہر آلود فضا اور ہوائیں مسموم
اک دھواں سا مری سانسوں میں نہاں ہے کہ جو تھا
کل بھی ظاہر تھا نگاہوں سے تری حزن و ملال
آج بھی لب پہ وہی حرفِ فغاں ہے کہ جو تھا
کل بھی اظہار کی جرأت نہ ہوئی تھی مجھ سے
آج بھی مسئلہ عرض بیاں ہے کہ جو تھا
ہو سکے تو اسے لفظوں سے بچا کے رکھنا
دل وہی آج بھی شیشے کا مکاں ہے کہ جو تھا
پھر ملا بھی تو وہ کس موڑ پہ کس منزل پہ
پھر وہی سلسلہ وہم و گماں ہے کہ جو تھا
تجھ کو کھوکر بھی کبھی تجھ سے جدا ہو نہ سکا
آج بھی دل میں وہی سوز نہاں ہے کہ جو تھا
ہم جہاں چھوڑ کے آئے تھے سرِ راہ اسے
آج بھی وہ اسی منزل پہ رواں ہے کہ جو تھا
آج بھی اپنے اصولوں پہ ہے قائم شامی
آج بھی دل میں وہی عزمِ جواں ہے کہ جو تھا

شاعری

غزلیں

جمال قدوسی

گم راہ کر رہی ہے نئی روشنی مجھے
اپنی ہی زیست لگتی ہے اب اجنبی مجھے

سایہ نہ کوئی ابر کا ٹکڑا ہے دور تک
لے آئی کس مقام پہ آوارگی مجھے

اک چشم التفات و محبت ادھر بھی ہو
دیمک سی کھا رہی ہے تری بے رخی مجھے

بے خوابی، اضطراب، کسک، ٹیس، غم، جلن
تو نے دیا ہے اور کیا اے زندگی مجھے

یہ سر نہیں جھکے گا کسی اور کے حضور
کہ زندگی سے پیاری ہے اپنی خودی مجھے

وہ حسن وہ جمال وہ رعنائی، دل کشی
رہ رہ کے یاد آتی ہے صورت تری مجھے

جو اہل زر کی یہاں اہمیت زیادہ ہے
نفس نفس میں یاں نفسانیت زیادہ ہے

ملا ہے آپ کو جس دن سے تاجِ سلطانی
جہاں پناہ مری خیریت زیادہ ہے

ہمارے گاؤں میں اب بھی ہے لاج شرم و حیا
تمارے شہر میں عریانیت زیادہ ہے

کبھی کیا آپ نے اس سمت غور فرمایا
پڑھے لکھے میں ہی حیوانیت زیادہ ہے

یہ تیری جیب کی ہے سب کرشمہ سازی جو
ہر ایک لب پہ تری تہنیت زیادہ ہے

زمانے بعد ہے ابلیس چین سے سویا
بستر سے اس کی کہیں ذریت زیادہ ہے

صلیب و دار کے مہماں بنیں گے آپ اک دن
حضور آپ میں حقانیت زیادہ ہے

جمال آپ کے شعروں میں شعریت ہے کہاں
غزل میں آپ کو موسیقیت زیادہ ہے

غزل ونظم

نسیم محمد جان

ضعیفی

آیا ہے اب بڑھاپا
سب کچھ ہوا مخالف
کیا وقت کیا زمانہ
اپنا نہیں رہا اب
موسم بھی ہے ستاتا
سرما ہو یا کے گرما
طاقت جو اب نہیں ہے
اب بوجھ زندگی ہے
اٹھنا ہوا ہے مشکل
چلنا ہوا ہے در بھر
مجبور زندگی ہے
اب چاہیے سہارا
جینا ہوا ہے مشکل
مرنا نہیں ہے آساں
سمجھے گا کوئی کیوں کر
ان کا نہیں بڑھاپا
کھانا زہر ہوا ہے
اب بھوک بھی نہیں ہے
اوروں کی کٹ رہی ہے
پر کاٹتی ہے مجھ کو
یہ زندگی ہماری

ابرار نغمی

لمحہ بہ لمحہ

دشتِ تنہائی شب اور یہ زخموں کی کسک
دور تک چاپ نہ آہٹ نہ ہی سایہ کوئی
مضمحل لمحہ بہ لمحہ ہوا جاتاہے بدن
دل پریشاں ہے، کدھر جاؤں ؟پکاروں کس کو
اوڑھے سنّاٹے کی چادر کو ہر اک راہ گذر

دور تک چاپ نہ آہٹ نہ ہی سایہ کوئی
میں مسافر میں ہی رہبر، کوئی منزل ہی نہیں
حوصلہ سوئے یقیں، ہے خط سمیں پھر بھی
ہاتفِ عزم یہ کہتا ہے کہ مایوس نہ ہو
ساعتیں تیرہ شبی کی یہ گذر جائیں گی
آمد صبح مداوائے شب غم ہوگی

جلوہ ساماں یہ سبھی داغ جگر کر دیکھو
دشت احساس سے پھر آج گذر کر دیکھو

قدوس جاوید

27, Green Hills Colony, Near Govt. Sec School,
Bhatindi, Jammu - 181 152

فیاض رفعت

328, Eldco Green Villa,
Gomti Nagar, Lucknow - 226010

طیبہ نازلی

Assistant Professor
Dept of Education & Training, MANUU
Gachibowli, Hyderabad - 500 032

عمران عاکف خان

Research Scholar, JNU, New Delhi - 110 067

نوشاد کامران

Allahabad University, Allahabad

رونق رئیس عبدالرحمٰن

B.N.N. College, Bhiwandi

لکشمی دیوی راج

8-2-310/A, Road No. 14, Banjara Hills,
Hyderabad - 500 034.

مشتاق احمد وانی

Asst. Prof. Dept of Urdu
Baba Ghulam Shah Badshah Univeristy
Rajouri Lane-3 H.No. 7 Firdous Abaad, Sunjawn,
Jamuu Tawi 180011

طیبہ خان

181, Street-2, Sohailabad, Near Iron Market,
Faisalabad, Pakistan - 0304-1259458

مظفر حنفی

D-40, Batla House, Jamia Nagar, New Delhi.

مسلم نواز

12-3-H/1, Patwar Bagan Lane,
Kolkata - 700 009

مصداق اعظمی

Jawma, Mejwa, Phoolpur, Azamgarh, Uttar
Pradesh - 276 304

ہارون شامی

3/137, Vivek Khand, Gomti Nagar
Lucknow - Uttar.Pradesh. 226 010

جمال قدوسی

Jamal Traders, Barhni Road, Ottwa Bazar,
Siddarth Nagar, U.P. - 272 192

نسیم محمد جان

Marifat Book Emporium, Sabzi Bagh, Patna -4

ابرار نعمی

Near Mohammadi Masjid, Ward No - 7
RAISEN (M.B) 464 551

AGHA SAHEB WITH GRANDSONS MIR SARFARAZ HUSSAIN
DR MIR ASGHAR HUSSAIN VERSAILLES PALACE FRANCE 1967

Regd. No. RNP/HD/970/2018-20 RNI No. 10922-57

THE "SABRAS" URDU MONTHLY

ORGAN OF IDARA-E-ADABIYAT-E-URDU

Rs. 30/- Vol.80, Issue-09 September, 2018 Date of Publication 15th & Postal Date 20th of every month.

Printed and Published by Prof.S.A.Shukoor on behalf of Idara-e-Adabiyat-e-Urdu,
Printed at Taahaa Print Systems, Lakdi-ka-pul, Hyderabad and Published at Idara-e-Adabiyat-e-Urdu
Aiwan-e-Urdu, Panjagutta Road, Somajiguda, Hyderabad-500 082 (T.S.) Editor : Prof. Baig Ehsas Ph : 040-23310469